داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- مضبوط ریگزین جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 4800 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ

دسمبر ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

قرآن کا تصوّرِ علم اور اس کی اہمیّت

ڈاکٹر ابصار احمد

منصبِ امامت اور اس کے تقاضے

حافظ عاطف وحید

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 70

شمارہ : 12

جمادی الاولیٰ 1443ھ

دسمبر 2021ء

فی شمارہ : 40 روپے

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی مُعاوِن:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-(042)35473375

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

طالبان حکومت کو درپیش چیلنجز — ادارہ

بیانُ القُرآن — 9

سورۃ المُجادَلۃ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

شہادتِ حق — 33

منصبِ اِمامت اور اُس کے تقاضے — حافظ عاطف وحید

تذکّر و تدبّر — 47

قرآن کا تصوّرِ علم اور اس کی اہمیت — ڈاکٹر ابصار احمد

اقبالیات — 57

اقبال: ایک تاریخ ساز شخصیت — راحیل گوہر

خودی نہ بیچ.... — ارسلان اللہ خان — 69

تذکیر و موعظت — 73

اسلامی اخوت کے تقاضے — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ظروف و احوال — 77

صہیونیت: کل اور آج — رضی الدین سیّد

علومِ قرآنی — 84

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

طالبان حکومت کو درپیش چیلنجز

افغانستان میں افغان طالبان حکومت کو قائم ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک دنیا میں کسی نے ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ المیہ یہ ہے کہ کسی مسلمان حکومت نے بھی ان کو تسلیم نہیں کیا۔ جہاں تک غیر مسلم دنیا کے تسلیم نہ کرنے کا تعلق ہے تو بات صاف ظاہر ہے کہ غیر مسلم دنیا چاہتی ہے کہ افغان طالبان اپنے نظریے پر چلنے کی بجائے عالمی استعماری نظام کو قبول کرلیں۔ خاص طور پر جس طرح کا معاشی نظام اس وقت دنیا کو اپنے معاشی پنجے میں جکڑے ہوئے ہے افغان طالبان بھی اسی کو فالو کریں تاکہ وہ بھی عالمی طاقتوں کی معاشی جکڑ بندی میں آجائیں اور پھر طاغوتی طاقتوں کے مطالبات کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے چلے جائیں۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی افغان طالبان کو اسلامی نظریہ پر قائم دیکھنے کی بجائے انہیں عالمی طاغوتی نظام کو تسلیم کرنے لینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ان کا نکتہ اعتراض وہی پرانا ہے جو نائن الیون کے بعد بھی ان کا اصل نکتہ تھا کہ آج کے دور میں دنیا پر قائم عالمی نظام کو فالو کیے بغیر کوئی بھی ریاست نہیں چل سکتی' آپ کو اپنی بقا کے لیے دنیا کے قوانین و ضوابط پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ پاکستان کے ایک نامور کالم نویس نے تو طاغوت کی ترجمانی کرتے ہوئے طاغوت کی خدائی کو تسلیم کرنے کی بالواسطہ دعوت بھی دے ڈالی ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ ''افغانستان قحط کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اقتصادیات کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا اگر نہ چاہے تو خوراک مل سکتی ہے نہ شناخت۔ جب تک طالبان کی حکومت کو قبول نہیں کیا جاتا' افغانستان دنیا سے الگ تھلگ رہے گا۔ یہ قبولیت امریکہ کی مرضی کے بغیر نہیں مل سکتی''۔ موصوف کی جو بات انتہائی تکلیف دہ اور قابلِ مذمت ہے وہ یہ ہے کہ ''آزادی افغانستان سے آج بھی اتنے ہی فاصلے پر ہے جتنی طالبان سے پہلے تھی۔''

نائن الیون کے بعد بھی عالمی میڈیا اور سیکولر دانشوروں کے یہی دعوے تھے کہ افغان

طالبان بس چند دنوں کی مار ہیں' ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا' امریکہ کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا وغیرہ۔ لیکن پھر دنیا نے دیکھا کہ وہی امریکہ جس کی خدائی کے دعوے اس کے ترجمان کر رہے تھے بیس سال افغانستان میں مار کھاتے کھاتے آخر ذلیل ہو کر افغانستان سے نکل بھاگا۔ اس غیر معمولی واقعہ میں دنیا کے لیے نشانیاں ہیں کہ اس دنیا کا نظام امریکہ نہیں چلا رہا بلکہ اس کائنات کا خالق و مالک چلا رہا ہے' جس کی مرضی کے بغیر پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ مسلمانوں کو یہ جان لینے کی ضرورت ہے کہ امریکہ ان پر جو طاغوتی غلبہ حاصل کر رہا ہے یہ اُمّتِ مُسلمہ کے گناہوں اور خطاؤں کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہی فیصلے کسی نہ کسی صورت میں صادر ہوتے ہیں' غالب اُسی ذاتِ برحق کا حکم ہوتا ہے۔ جہاں تک مؤمنین صادقین کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں فیصلہ سنا دیا ہے کہ: ''تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان والے ہوئے!''

المیہ افغانستان میں نہیں' اسلام سے مسلمانوں کے دور ہونے میں ہے جس کی وجہ سے وہ قرآن کی نظر سے چیزوں کو دیکھ نہیں پاتے بلکہ وہ مغرب کی نظر سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں۔ وہ دنیا کی کامیابی کو اصل کامیابی اور دنیا کے نقصان کو المیہ کہتے ہیں۔ حالانکہ اصل المیہ تو آخرت کی ناکامی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا اصل زندگی نہیں بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔ یہ آزمائش افغان طالبان کے لیے بھی ہے اور امریکہ کی زبان بولنے والوں کے لیے بھی۔ اللہ ربّ العزت قرآن حکیم میں ہم سب مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ (البقرۃ)

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ اُن پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اُس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے!''

آج جیسے دانشور اسلام کے ابتدائی دور میں مکّہ میں موجود ہوتے اور حضرات سُمیّہ و یاسر' بلالِ حبشی اور خباب بن الارت رضی اللہ عنہم پر گزرنے والی مصیبتوں کا حال اور شعب ابی طالب میں

مسلمانوں کی حالت زار اور فاقوں کی کیفیت دیکھتے تو اسی طرح واویلا کرتے نظر آتے کہ کفر کے نظام کے ساتھ سمجھوتہ کیے بغیر کسی کی اس دنیا میں بقا ممکن نہیں۔ مشرکینِ مکّہ کا مطالبہ بھی تو یہی تھا کہ ہمارے ساتھ سمجھوتہ کرلو۔ یعنی کچھ قوانین اپنے چلاؤ اور کچھ ہمارے نظام کے قوانین اپنا لو تو ہم سب مل کر ایک مشترکہ نظام سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ آج بھی جو دانشور افغانستان میں انسانی المیہ کا راگ الاپ رہے ہیں اور بین کر رہے ہیں' ان کا اصل مدّعا بھی یہی ہے کہ افغان طالبان عالمی قوانین کو اپنا لیں تو پھر کوئی حرج نہیں۔ ان کو عالمی امداد بھی آئے گی' ڈالروں کی بارش بھی ہوگی اور عالمی سطح پر تجارتی وفود بھی آنا شروع ہو جائیں گے۔ دنیا بھی راضی اور افغانی بھی خوشحال ہو جائیں گے۔ یہ اِس وقت کے عالمی نظام کے مستری اور دانشور کہہ رہے ہیں۔ جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾﴾ (البقرۃ)

''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین (نظام) پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے' تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہارے لیے اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے۔''

طالبان کے لیے اصل چیلنج اس وقت اپنے اور افغانیوں کے ایمان کو بچانا ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے چیلنج افغانستان کی وہ نسل ہے جس کو سیکولر بنانے کے لیے ساری دنیا کی طاغوتی طاقتوں نے بیس سال تک خوب انوسٹمنٹ کی ہے۔ اب اس نسل کے لیے آخرت سے زیادہ اہم دنیا ہے۔ طالبان کے لیے اصل چیلنج اس نسل کو دوبارہ دین کی طرف لانا ہے۔ اگر طالبان کو اس میں کامیابی حاصل ہوگئی تو ان کو کوئی نہیں ہرا سکتا' نہ عسکری میدان میں نہ معاشی میدان میں۔ کیونکہ جس طرح عسکری میدان میں ان کی آزمائش تھی اسی طرح معاشی میدان بھی ان کے لیے آزمائش ہے' اور جس طرح عسکری میدان میں کامیابی صرف اللہ کی مدد سے ممکن تھی اسی طرح معاشی میدان میں بھی کامیابی صرف اللہ کی مدد سے ممکن ہے' اور اللہ کی مدد کا راز بھی اللہ تعالیٰ نے متذکرہ بالا آیت (البقرۃ:۱۲۰) میں بتا دیا ہے۔

دنیا کی آنکھ سے دیکھنے والوں کو کامیابی اس میں نظر آ رہی ہے کہ افغان طالبان عالمی نظام کے مطیع ہو جائیں تو سب اچھا ہو جائے گا' جبکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ پھر سب اچھا نہیں ہوگا بلکہ یہ بہت ضرر رساں اور المناک ہے۔ یہی تو اصل میں اس دنیا کی زندگی کی حقیقت ہے جس کو وہ اذہان سمجھ نہیں پاتے جن کی فکری بلوغت مغربی نظام اور فکر کے تحت ہوئی ہے۔ اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اصل تقاضا ہی یہی ہے کہ مسلمان کس کو رب مانتے ہیں' کس پر بھروسا کرتے ہیں؟

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾﴾ (البقرۃ)

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے خوف کے ذریعے' بھوک کے ذریعے' مال اور جان کے نقصان سے' پھلوں کی کمی سے اور (اے نبی ﷺ!) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجیے۔ وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ خلافت کے انہدام کے بعد دنیا پر دجالی نظام کا غلبہ ہے۔ فتنۂ دجال میں اصل آزمائش تو یہی ہے کہ دجال کے پاس روٹیوں کا پہاڑ ہوگا۔ جو دجّال کو رب مان لیں گے اُن کو پیٹ بھر کر کھانا بھی ملے گا اور دنیا کی ہر سہولت ملے گی اور جو اس کا انکار کریں گے ان پر فاقوں کی نوبت آئے گی۔ اس فتنہ میں مسلمانوں کی اصل آزمائش اپنے دین اور ایمان پر استقامت ہے۔ افغان طالبان نے بیس سال عسکری میدان میں اپنا خون بہایا ہے' لاکھوں مسلمان طاغوتی قوتوں نے تہِ تیغ کر ڈالے' کڑکتی دھوپ میں کنٹینروں میں بند کر کے مارے گئے' ان کے گھر بار اُجڑ گئے' کھیت کھلیان چھین لیے گئے۔ ان حالات میں عالمی میڈیا اور سیکولر دانشوروں کو انسانی المیہ نظر کیوں نہ آیا جب افغانستان پر بلا وجہ جنگیں مسلّط کر کے افغانیوں کا جانی اور مالی نقصان کیا گیا؟ ان کو صرف اسلامی نظام کے نفاذ میں ہی انسانی المیہ کیوں نظر آتا ہے؟ طاغوتی نظام کے تحت قتل و غارت گری بھی انہیں قبول ہے' لیکن اسلامی نظام کا امن بھی انہیں قبول نہیں۔ آخر کیوں؟

افغان طالبان نے ان بیس سالوں میں طاغوتی طاقتوں کے تمام تر ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کے ماحول میں بھی ایمان پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا ہے (باقی صفحہ 46 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْمُجَادَلَۃ

تمہیدی کلمات

سورۃ المجادلہ کا آغاز ایک خاص عائلی مسئلے سے ہوتا ہے‘ لیکن یہ مسئلہ صرف پہلی چار آیات میں ضمنی مضمون کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد اس سورت میں سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون ہی کا تسلسل نظر آتا ہے۔ سورۃ الحدید کا مرکزی مضمون نظامِ عدل وقسط کے قیام سے متعلق ہے۔ اس نظام کے قیام کی جدّوجُہد کے لیے ایک منظّم اور مربوط جماعت کی ضرورت ہے۔ یہ کسی اکیلے شخص یا دو چار افراد کے بس کا کام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے تعاون کے بغیر بھی اسے سرانجام دے لیتے۔ آپؑ نے جب اپنی قوم کو جہاد کے لیے نکلنے کا کہا تو انہوں نے صاف جواب دے دیا:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ (المائدۃ)

انہوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ اے موسیٰ! یہ جنگ جیسا مشکل کام ہم سے نہیں ہوتا‘ اگر یہ ایسا ہی ضروری کام ہے تو آپؑ اور آپ کا ربّ جا کر لڑو‘ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ اُس وقت آپؑ بالکل اکیلے بھی نہیں تھے‘ بلکہ آپؑ کے ساتھ تین لوگ اور بھی تھے۔ یعنی آپؑ کے بھائی ہارونؑ‘ حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا۔ اس کے باوجود آپؑ نے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا مشن ادھورا چھوڑتے ہوئے پُرحسرت انداز میں اللہ تعالیٰ سے شکایت کی:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۵﴾ (المائدۃ)

’’موسیٰؑ نے عرض کیا: پروردگار! مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے‘ تو اب تُو تفریق کر دے ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔‘‘

تو معلوم ہوا کہ یہ کام چند افراد کے بس کا بھی نہیں‘ بلکہ باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنے اور اس کی جگہ نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے ایک بہت مضبوط اور منظّم جماعت درکار ہے۔ اب ظاہر ہے جب یہ جماعت تشکیل پائے گی اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مصروفِ عمل ہوگی تو شیطان انہیں کھلی چھٹی دے کر آرام سے تو نہیں بیٹھا رہے گا کہ جاؤ بھئی آپ اپنے دینِ حق کا قیام عمل میں لے آؤ‘ بلکہ وہ بھی فوری طور پر اپنے چیلے چانٹوں کے ہمراہ اس جماعت کا راستہ روکنے کے لیے میدان میں کود پڑے گا۔ اس طرح یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مدِّمقابل صف آرا ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس سورت میں نظامِ عدل وقسط کے قیام یا اقامتِ دین کے لیے جدّوجُہد کرنے والی جماعت ’’حزب اللہ‘‘ اور اس کے مدِّمقابل شیطان کے لاؤلشکر پر مشتمل جماعت ’’حزب الشیطان‘‘ کا بھی ذکر آیا ہے اور اس حوالے سے حزب اللہ کے کارکنوں کو کچھ مفید ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ حزب اللہ کا وجود چونکہ شیطان کو بہت کھٹکتا ہے اس لیے وہ اس میں پھوٹ ڈالنے اور اس کی وحدت کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایسے شیطانی حملوں کے توڑ کے لیے اہلِ ایمان کو قرآن میں جابجا ہدایات دی گئی ہیں۔ سورۃ الحجرات میں دی گئی معاشرتی اور اخلاقی ہدایات کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد و یگانگت کو فروغ دیں اور کوئی ایسا عمل نہ کریں جو ان کے اتحاد کو نقصان پہنچانے کا باعث بنے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں اہلِ ایمان کو ایک دوسرے کا تمسخر اڑانے‘ باہم الزام تراشی کرنے‘ دوسروں کو بُرے ناموں سے پکارنے‘ اپنے بھائی بندوں کے بارے میں بدگمانی کرنے‘ ان کے معاملات کی ٹوہ میں رہنے‘ افواہوں پر کان دھرنے اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی حرکات سے بالآخر مسلمانوں کی وحدت اور یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح سورۃ الحجرات میں اہلِ ایمان کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ اگر ان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کی صلح کرا دی جائے تاکہ ’’حزب اللہ‘‘ مضبوط و مستحکم رہے۔ بہرحال سورۃ المجادلہ کا مرکزی مضمون حزب اللہ سے متعلق ہے۔ حزب اللہ بھلائی کی علامت اور نیکی کی طاقت ہے۔ اگر یہ جماعت مضبوط ہوگی تو نیکی کا بول بالا ہوگا اور اگر یہ کمزور ہو جائے گی تو پھر ظاہر ہے معاشرے میں حزب الشیطان ہی کا ڈنکا بجے گا۔

آیات ۱ تا ۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُکَ فِیۡ زَوۡجِہَا وَ تَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ۖ
وَ اللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ۝۱ اَلَّذِیۡنَ
یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ؕ اِنۡ اُمَّہٰتُہُمۡ اِلَّا
الّٰٓـِٔیۡ وَلَدۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّہُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡکَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَزُوۡرًا ؕ
وَ اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ ۝۲ وَ الَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡ نِّسَآئِہِمۡ
ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا فَتَحۡرِیۡرُ رَقَبَۃٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا ؕ
ذٰلِکُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۝۳ فَمَنۡ لَّمۡ یَجِدۡ
فَصِیَامُ شَہۡرَیۡنِ مُتَتَابِعَیۡنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنۡ لَّمۡ
یَسۡتَطِعۡ فَاِطۡعَامُ سِتِّیۡنَ مِسۡکِیۡنًا ؕ ذٰلِکَ لِتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ
رَسُوۡلِہٖ ؕ وَ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ ؕ وَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝۴

آیت ۱ ﴿قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ قَوۡلَ الَّتِیۡ تُجَادِلُکَ فِیۡ زَوۡجِہَا﴾ ’’اللہ نے سن لی اُس عورت کی بات (جو اے نبی ﷺ!) آپ سے جھگڑ رہی ہے اپنے شوہر کے بارے میں‘‘

﴿وَتَشۡتَکِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ۖ﴾ ’’اور وہ اللہ سے بھی فریاد کر رہی ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰہُ یَسۡمَعُ تَحَاوُرَکُمَا ؕ﴾ ’’اور اللہ سن رہا ہے آپ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو۔‘‘

﴿اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ۝۱﴾ ’’یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا‘ سب کچھ دیکھنے والا ہے۔‘‘

’’قَدۡ سَمِعَ اللّٰہُ‘‘ کے معنی یہاں محض سن لینے کے نہیں‘ بلکہ قبول کر لینے اور فریاد رسی کرنے کے ہیں۔ یہ ’’ظہار‘‘ کے معاملے کا ذکر ہے جو ایک صحابی حضرت اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے درمیان پیش آیا۔ کسی شخص کا اپنی بیوی کو اپنی ماں یا اپنی

ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دینا اصطلاحاً ’’ظہار‘‘ کہلاتا ہے‘ مثلاً کسی کا اپنی بیوی کو یوں کہہ دینا کہ تم میرے لیے میری ماں کی طرح ہو یا میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ عربوں کے ہاں اس کے لیے یہ الفاظ کہے جاتے تھے: ’’اَنۡتِ عَلَیَّ کَظَھۡرِ اُمِّی‘‘ یعنی اب تجھ کو ہاتھ لگانا میرے لیے گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگانا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ظہار کو طلاق ہی کی طرح سمجھا جاتا تھا‘ بلکہ طلاق میں تو حالات وقرائن کے مطابق پھر بھی رجوع کی گنجائش تھی‘ لیکن ظہار کی صورت میں میاں بیوی میں عمر بھر کے لیے علیحدگی ہو جاتی تھی اور وہ دوبارہ کبھی کسی بھی صورت میں میاں بیوی کے طور پر اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔

روایات میں مذکورہ معاملے کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ حضرت اوس رضی اللہ عنہ غصے کی حالت میں اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے۔ اس پر ان کی بیوی حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا فریاد لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ حضورؐ! اوسؓ نے یہ کر دیا ہے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں‘ اب میں ان کو لے کر کہاں جاؤں گی؟ ان کو کیسے پالوں گی؟ آپؐ اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ظہار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ابھی تک کوئی حکم نازل نہیں فرمایا‘ اس لیے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ حضور ﷺ کے توقف پر وہ بدستور اصرار کرتی رہیں کہ حضور ﷺ آپ کچھ کریں!‘ میرا کیا بنے گا؟ میرے بچے ہلاک ہو جائیں گے! اسی کیفیت میں کبھی وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتیں کہ اے اللہ! تو میری فریاد کو سن لے اور میرے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے! روایات کے مطابق اس اصرار وتکرار کے دوران ہی زیر مطالعہ آیات نازل ہوئیں۔ پہلی آیت کا انداز خصوصی طور پر بہت شفقت بھرا ہے کہ اے نبی ﷺ! اللہ نے اس خاتون کی اس بحث وتکرار کو سن لیا ہے جو وہ آپؐ کے ساتھ کر رہی ہے۔ حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ کی فریاد پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دریا موج میں آیا اور ظہار کے بارے میں مستقل قانون بنا دیا گیا۔ یہ قانون اگلی تین آیات میں بیان ہوا ہے۔

آیت ۲ ﴿اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ؕ﴾

’’(اے مسلمانو!) تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں کو مائیں کہہ بیٹھتے ہیں‘ وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔‘‘

جس طرح کسی کو کوئی بیٹا کہہ دے تو وہ اس کا بیٹا نہیں بن جاتا اور جس طرح منہ بولے بیٹے

کی کوئی قانونی وشرعی حیثیت نہیں اسی طرح زبان سے اگر کوئی اپنی بیوی کو اپنی ماں کہہ دے تو ایسے کسی دعوے یا جملے کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ﴾ ''ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا ہے۔''

﴿وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ﴾ ''البتہ یہ لوگ ایک نہایت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔''

یہ لوگ اپنی بیویوں کو اپنی مائیں کہہ کر ایک نہایت بے ہودہ' شرمناک اور نامعقول بات منہ سے نکالتے ہیں۔ پھر یہ بات جھوٹی بھی ہے کہ ان کی بیویاں ان کے لیے اب مائیں ہوگئی ہیں۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲﴾ ''اور یقیناً اللہ بہت معاف فرمانے والا' بہت بخشنے والا ہے۔''

ان الفاظ میں یہ اشارہ دے دیا گیا کہ ظہار سے متعلق چونکہ ابھی تک کوئی قانون نازل نہیں ہوا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ مذکورہ صحابیؓ کو اس معاملے میں معاف فرما دے گا' بلکہ اس سے پہلے جس کسی سے بھی یہ حرکت سرزد ہوئی' اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائے گا۔

آیت ۳ ﴿وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا﴾ ''اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھیں' پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے واپس لوٹنا چاہیں''

﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ﴾ ''تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہوگا' اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کو مَس کریں۔''

یعنی اس معاملے کا کفّارہ ادا کرو اور پھر سے میاں بیوی کی طرح رہو!

﴿ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۳﴾ ''یہ بات ہے جس کی تمہیں نصیحت کی جا رہی ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۴ ﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ﴾ ''تو جو کوئی (غلام) نہ پائے وہ دو مہینوں کے روزے رکھے لگاتار' اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چھوئیں۔''

یعنی دو ماہ کے روزے اس طرح متواتر رکھے جائیں کہ درمیان میں کسی دن کا روزہ چھوٹنے نہ پائے۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ﴾ ''تو جو کوئی یہ بھی نہ کر سکتا ہو تو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔''

اگر کوئی شخص کمزور ہے' ضعیف العمر ہے یا ایسا مریض ہے کہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا اس کے لیے ممکن نہیں تو وہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے۔ اس کے لیے اوسط معیار وہی ہوگا جو سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۹ میں قسم کے کفّارے کے ضمن میں بیان ہوا ہے: ﴿مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ یعنی جس معیار کا کھانا متعلقہ شخص اپنے اہل وعیال کو معمول کے مطابق کھلاتا ہے' ویسا ہی کھانا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھلائے۔

﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ﴾ ''یہ اس لیے تاکہ تم ایمان رکھو اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر۔''

اس فقرے پر میں بہت عرصہ سوچ بچار کرتا رہا' بالآخر مجھے اس بارے میں یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ جب کوئی شخص کفّارہ کو اللہ تعالیٰ کا قانون سمجھتے ہوئے اس کی سختی برداشت کرتا ہے تو اس کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ایمان سے عملِ صالح پیدا ہوتا ہے' اسی طرح عملِ صالح سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے' جیسے کہ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۷﴾

''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں! ان سے کہیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے' اگر تم سچے ہو۔''

یعنی تم لوگ اسلام میں داخل ہو کر گویا ایمان کے راستے پر چل پڑے ہو۔ اس بارے میں تم اللہ کا احسان مانو کہ وہ تمہیں ایمان کے راستے پر لے آیا ہے۔ اگر تم اخلاص کے ساتھ اس راستے پر چلتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے رہو گے تو تم ایمان تک بھی ضرور پہنچ جاؤ گے۔ یہاں ﴿ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص غلطی کے بعد توبہ

کرتے ہوئے کفّارہ ادا کرے گا تو اللہ کے قانون پر عمل درآمد کرنے کی وجہ سے اس کے دل میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول مزید راسخ اور پختہ ہو جائے گا۔

﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴﴾ ’’اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدود ہیں‘ اور کافروں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔‘‘

آیات ۵ تا ۱۱

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ۝۵ۚ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ
اللّٰهُ وَ نَسُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۶ۧ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى
ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَ لَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَ لَآ اَدْنٰى
مِنْ ذٰلِكَ وَ لَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ
بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷ اَلَمْ تَرَ
اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ
يَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَ اِذَا
جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْ
لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ
الْمَصِيْرُ ۝۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ
وَ الْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ؕ وَ
اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ
لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا

قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا
قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱

آیت ۵ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو تُل گئے ہیں مخالفت کرنے پر اللہ اور اُس کے رسولؐ کی‘‘

اس مضمون کا تعلق سورۃ الحدید کے مرکزی مضمون کے ساتھ ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں انبیاء و رسل علیہم السلام کی بعثت اور کتاب و میزان کے نزول کا مقصد یہ بتایا گیا ہے: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے نظامِ عدل وقسط کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ اب ظاہر ہے اہل ایمان جونہی اس مشن کے علمبردار بن کر اٹھیں گے تو شیطانی قوتیں بھی ان کا راستہ روکنے کے لیے پوری قوت سے سرگرم عمل ہو جائیں گی۔ ان حالات میں معاشرے کا سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ نظامِ عدل وقسط کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو گا۔ یہ لوگ تو کبھی بھی نہیں چاہیں گے کہ مزدوروں اور کسانوں کو ان کے حقوق ملیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ روایتی (ظالمانہ) نظام کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑیں گے۔ اس طرح فریقین کے درمیان ایک بھرپور کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آیت زیر مطالعہ میں انہی قوتوں کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ آئندہ آیات میں ان دونوں گروہوں کے کردار اور رویے کا ذکر حزب اللہ اور حزب الشیطان کے نام سے آئے گا۔

واضح رہے کہ لفظ يُحَآدُّوْنَ کا تعلق بھی حدید (سورۃ الحدید‘ آیت ۲۵) ہی سے ہے۔ یہ حدّ سے باب مفاعلہ ہے‘ جیسے جہد سے مُجاھَدہ یا قتل سے مُقاتَلہ۔ چنانچہ اس لفظ میں پوری قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کسی کی مخالفت کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مراد اللہ کا دین ہے اور یہ مخالفت جس کا یہاں ذکر ہے وہ دراصل اللہ کے دین کی مخالفت ہے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی تکوینی حکومت جو پوری دنیا میں قائم ہے اسے تو سبھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے کسی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی کسی کو کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ چنانچہ دنیا میں جہاں کہیں اللہ کے رسولؐ کی مخالفت کی جاتی ہے وہ بھی اللہ کے دین کی وجہ سے ہی کی جاتی ہے۔

اس نکتہ کو سورۃ الانعام کی اس آیت میں یوں واضح کیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٣٣﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلا رہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں''۔ چنانچہ باطل قوتوں کی اصل دشمنی اللہ کے دین سے ہے' اور یہ دین بھی جب تک کتابوں اور لائبریریوں تک محدود رہے تب تک اس پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ دینی مسائل کے بارے میں کوئی اعلیٰ سطحی تحقیقات کرے' مقالے لکھے' کتابیں تصنیف کرے' کسی کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ لیکن جب کوئی اللہ کا بندہ یہ دعویٰ کرے کہ ہم اللہ کے دین اور اُس کے دیے ہوئے نظامِ عدل وقسط کی معاشرے میں بالفعل ترویج وتنفیذ چاہتے ہیں تو اس کی یہ بات باطل پسند قوتوں کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ لوگ ایسی کسی بھی کوشش کا راستہ روکنے کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں آ جاتے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔

﴿كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ''وہ ذلیل وخوار کر دیے جائیں گے جس طرح ان سے پہلے کے لوگ ذلیل وخوار کیے جا چکے ہیں''

ان سے پہلے قومِ فرعون' قومِ عاد اور بہت سی دوسری اقوام نے بھی اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولوںؑ کی مخالفت کی یہی روش اختیار کر کے اپنی بربادی کو دعوت دی تھی۔ چنانچہ جو انجام مذکورہ اقوام کا ہوا ویسے ہی انجام سے اب یہ لوگ یعنی قریشِ مکہ بھی دوچار ہونے والے ہیں۔

﴿وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۭ﴾ ''اور ہم اتار چکے ہیں روشن آیات۔''

یعنی قرآن میں گزشتہ اقوام کے واقعات بہت تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر قومیں قریشِ مکہ کی نسبت بہت طاقتور تھیں۔ جب ایسی طاقتور اقوام بھی اپنے پیغمبروں کے انکار کی بنا پر صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں تو آج ان لوگوں کی سرکشی ونافرمانی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٥﴾﴾ ''اور کافروں کے لیے بہت ذِلّت والا عذاب ہے۔''

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفین کو دنیا میں بھی ہزیمت اٹھانا پڑے گی اور آخرت میں بھی انہیں بہت رسوا کن عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

آیت ۶ ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ﴾ ''جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا' پھر انہیں جتلا دے گا ان کے اعمال کے بارے میں جو انہوں نے کیے تھے۔''

﴿اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ﴾ ''اللہ نے ان (اعمال) کو محفوظ کر رکھا ہے جبکہ وہ انہیں بھول چکے ہیں۔''

یہ لوگ تو بھول چکے ہوں گے کہ انہوں نے اپنی دنیوی زندگی میں کیسی کیسی حرام خوریاں کی تھیں اور کس کس کے ساتھ کیا کیا زیادتی کی تھی۔ لیکن ظاہر ہے اللہ کے ہاں تو ہر شخص کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت کا ریکارڈ محفوظ ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿٦﴾﴾ ''اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔''

آیت ۷ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سب کچھ کے بارے میں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے؟''

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ ''نہیں ہوتے کبھی بھی تین آدمی سرگوشیاں کرتے ہوئے مگر ان کا چوتھا وہ (اللہ) ہوتا ہے''

﴿وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ﴾ ''اور نہیں (سرگوشی کر رہے) ہوتے کوئی پانچ افراد مگر ان کا چھٹا وہ (اللہ) ہوتا ہے''

خفیہ انداز میں سرگوشیاں کرنے کو ''نجویٰ'' کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہاں پر ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیں کہ کسی تنظیم یا جماعت کے اندر نجویٰ کا رجحان یا رواج گروہ بندیوں اور فتنوں کا باعث بنتا ہے۔ کسی بھی اجتماعیت کے افراد میں باہم اختلافِ رائے کا پایا جانا تو بالکل ایک فطری تقاضا ہے' جہاں اجتماعیت ہوگی وہاں لوگ ایک دوسرے کی آراء سے اختلاف بھی کریں گے۔ لیکن ایسے اختلافات کا اظہار اجتماعیت کے قواعد وضوابط کے مطابق متعلقہ فورم پر کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ تخریبی ذہنیت کے حامل کچھ ارکان اپنے اپنے اختلاف کا اظہار نجویٰ کی صورت میں دوسرے ساتھیوں سے کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بات آگے بڑھتی ہے

تو چند افراد پر مشتمل ایک مخصوص لابی بن جاتی ہے اور یوں تنظیم یا جماعت کے اندر باقاعدہ گروہ بندی کی بنیاد رکھ دی جاتی ہے۔ اگر اختلافات کا اظہار مناسب فورم پر ہو تو کھلی اور تعمیری بحث کا نتیجہ ہمیشہ مثبت رہتا ہے۔ اس سے غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں‘ ابہام دور ہو جاتا ہے اور اصل حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ بہرحال نجویٰ (سرگوشیوں) کی حیثیت اجتماعیت کے لیے سمِ قاتل کی سی ہے اور اگر یہ زہر کسی جماعت کی صفوں میں سرایت کر جائے تو اس کا اِتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

﴿وَلَآ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِکَ وَلَآ اَکۡثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمۡ اَیۡنَ مَا کَانُوۡا ۚ﴾ ’’اور نہیں ہوتے وہ اس سے کم (یعنی دو افراد سرگوشی میں مصروف) اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔‘‘

سورۃ الحدید کی آیت ۴ میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: ﴿وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ﴾ ’’اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔‘‘

﴿ثُمَّ یُنَبِّئُھُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝۷﴾ ’’پھر وہ ان کو جتلا دے گا قیامت کے دن جو کچھ بھی انہوں نے عمل کیا تھا‘ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘

آیت ۸ ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ نُھُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی ثُمَّ یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا نُھُوۡا عَنۡہُ﴾ ’’کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں منع کیا گیا تھا نجویٰ سے‘ پھر وہ اعادہ کر رہے ہیں اُسی شے کا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا‘‘

یہ مدینہ کے منافقین کا ذکر ہے جو یہودیوں کے ساتھ مل کر ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بُننے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ یہاں اَلَّذِیۡنَ نُھُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی کے الفاظ میں سورۃ النساء کی آیت ۱۱۴ کے اس حکم کی طرف اشارہ ہے: ﴿لَا خَیۡرَ فِیۡ کَثِیۡرٍ مِّنۡ نَّجۡوٰىھُمۡ﴾ کہ ان لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ آیت زیرِ مطالعہ میں سورۃ النساء کی آیت کے حوالے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ المجادلہ‘ سورۃ النساء کے بعد نازل ہوئی۔

﴿وَ یَتَنٰجَوۡنَ بِالۡاِثۡمِ وَ الۡعُدۡوَانِ وَ مَعۡصِیَتِ الرَّسُوۡلِ ۫﴾ ’’اور وہ

سرگوشیاں کرتے ہیں گناہ‘ زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی سے متعلق۔‘‘

قبل ازیں سورۃ النساء کے مطالعے کے دوران بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتی اطاعت کا حکم منافقین کو بہت برا لگتا تھا۔ اس حوالے سے ان کا موقف یہ تھا کہ ہم اللہ کی اطاعت بھی کرتے ہیں‘ اللہ کی کتاب کے تمام احکام بھی تسلیم کرنے کو تیار ہیں‘ لیکن اپنے جیسے ایک انسان کی تمام باتوں کو من وعن تسلیم کرنے کو ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی سوچ اور اسی موقف کے تحت وہ لوگ حضور ﷺ کے فیصلوں پر گاہے بگاہے اعتراضات بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کے ایسے ہی ایک اعتراض کا ذکر سورۂ محمد کی آیت ۲۰ میں بھی آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تو قریش کے ساتھ خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شروع کر کے حالات کیوں خراب کیے جا رہے ہیں؟

﴿وَاِذَا جَآءُوۡکَ حَیَّوۡکَ بِمَا لَمۡ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ ۙ﴾ ’’اور جب وہ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ کو اُس (کلمہ) سے دعا دیتے ہیں جس سے اللہ نے آپؐ کو دعا نہیں دی‘‘

’’تَحِیَّۃ‘‘ کے لغوی معنی کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ملتے وقت ’’حَیَّاکَ اللّٰہُ‘‘ کے جملے کا تبادلہ کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اچھی زندگی دے‘ یا اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی دراز کرے۔ عرفِ عام میں اس دعا کو ’’تحیّہ‘‘ کہا جاتا تھا۔ اسلام نے دو مسلمانوں کی ملاقات کے موقع کے لیے دعائیہ کلمہ (greetings) کے طور پر السّلام علیکم کے الفاظ کا انتخاب کیا‘ لیکن تحیّہ کا لفظ عربوں کے ہاں چونکہ بہت معروف تھا اس لیے ’’السّلام علیکم‘‘ کو بھی اصطلاحاً ’’تحیّہ‘‘ ہی کہا جانے لگا۔ سورۃ النساء کی آیت ۸۶ میں یہ لفظ ’’السّلام علیکم‘‘ ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔ آیت زیرِ مطالعہ میں منافقین کی اس شرارت کا ذکر ہے جو وہ اس کلمہ تحیہ کے حوالے سے کرتے تھے۔ جب وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تو السّلام علیکم نے کے بجائے ’’السّام علیکم‘‘ کہتے۔ ’’سام‘‘ کے معنی موت کے ہیں اور اس طرح اپنی طرف سے وہ لوگ حضور ﷺ اور آپؐ کی محفل میں موجود مسلمانوں کے لیے اس دعائیہ کلمہ کو (معاذ اللہ!) بددعا میں بدل دیتے تھے۔

﴿وَیَقُوۡلُوۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِھِمۡ لَوۡلَا یُعَذِّبُنَا اللّٰہُ بِمَا نَقُوۡلُ ؕ﴾ ’’اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا ہمارے اس طرح کہنے پر؟‘‘

ایسی حرکت کرنے کے بعد وہ سوچتے کہ اگر محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہوتے تو اللہ ان کی یہ توہین کبھی برداشت نہ کرتا اور اس گستاخی پر وہ فوراً ہماری زبانیں کھینچ لیتا۔ چنانچہ ہمارے بار بار ایسا کہنے پر بھی اگر ہمیں کچھ نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔ یہ مرضِ منافقت کی وہ سٹیج ہے جس کا ذکر سورۃ الحدید کی آیت ۱۴ میں آ چکا ہے۔ اس سٹیج پر منافق شخص کے بچے کھچے ایمان میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھنے لگتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایمان کی تھوڑی بہت پونجی بھی برف کی طرح پگھلنے اور ضائع ہونے لگتی ہے۔

﴿حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ⑧﴾ ''ان کے لیے تو اب جہنّم ہی کافی ہے' یہ اس میں داخل ہوں گے' پس وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۹ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اگر تمہیں کوئی سرگوشی کرنی ہو''

﴿فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ﴾ ''تو گناہ' زیادتی اور رسولؐ کی نافرمانی کی باتوں سے متعلق ہرگز سرگوشی نہ کرو''

اگر تم میں سے چند لوگوں کا علیحدہ بیٹھ کر کوئی گفتگو یا منصوبہ بندی کرنا ناگزیر ہو تو یاد رکھو' تمہاری اس خفیہ بات چیت یا سرگوشی کا موضوع ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے جس سے گناہ' کسی پر زیادتی یا اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

﴿وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ﴾ ''ہاں تم نیکی اور تقویٰ کے بارے میں سرگوشی کر سکتے ہو۔''

کسی کو علیحدگی میں لے جا کر کوئی اچھا مشورہ دینا ہو' نیکی کے کسی کام کا بتانا ہو' یا صدقہ و خیرات کی تلقین کرنی ہو تو ایسی سرگوشیوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ⑨﴾ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تمہیں جمع کیا جائے گا۔''

آیت ۱۰ ﴿إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ﴾ ''یہ نجویٰ تو شیطان کی طرف سے ہے''

منفی سرگوشیاں کرنا ایک شیطانی عمل ہے۔ جو لوگ اس میں ملوث ہوتے ہیں انہیں اس کی تحریک وترغیب شیطان ہی کی طرف سے ملتی ہے۔

﴿لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ ''تاکہ وہ اہلِ ایمان کو رنجیدہ کرے''

ان لوگوں کی سرگوشیوں اور خفیہ ملاقاتوں کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو نقصان پہنچا کر انہیں رنجیدہ' دل گرفتہ اور پریشان کریں۔ آیت کے ان الفاظ سے یہ مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی محفل سے الگ جا کر کُھسر پُھسر اور سرگوشیاں اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے اس عمل کو دیکھ کر مسلمان پریشان ہوں کہ یہ لوگ الگ بیٹھ کر ان کے خلاف نہ جانے کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ گویا یہ لوگ ایک نفسیاتی حربے کے طور پر بھی نجویٰ کرتے تھے۔ ظاہر ہے جب بھری محفل سے تین چار لوگ الگ جا کر بیٹھ جائیں اور کُھسر پُھسر کرنا شروع کر دیں تو اہلِ محفل کو فطری طور پر تجسّس تو ہوگا کہ ہو نہ ہو یہ لوگ ضرور انہی کے خلاف باتیں کر رہے ہیں۔

﴿وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ﴾ ''حالانکہ یہ (شیطان) انہیں کچھ بھی ضرر پہنچانے پر قادر نہیں مگر اللہ کے اذن سے۔''

شیطان اپنے ارادے اور اختیار سے اہلِ ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ اگر اللہ کی طرف سے کسی کے لیے کوئی تکلیف یا آزمائش طے ہے تو وہ ضرور آئے گی' اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑩﴾ ''اور اہلِ ایمان کو صرف اللہ پر توکّل کرنا چاہیے۔''

اہلِ ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور شیطانی حربوں یا دشمنوں کی سازشوں سے ان کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اسی بھروسے کے ساتھ انہیں ہر وقت اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے۔

آیت ۱۱ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ﴾ ''اے مسلمانو! جب تمہیں کہا جائے کہ مجالس میں کھل کر بیٹھو تو کھل جایا کرو' اللہ تمہارے لیے کشادگی پیدا کر دے گا۔''

یہ سمجھانے کا بہت عمدہ انداز ہے۔ یہ نصیحت بھی دراصل منافقین کے ایک مخصوص طرزِ عمل کی وجہ سے کی جا رہی ہے۔ منافقین کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کی محفلوں میں ٹولیوں کی صورت میں باہم جڑ کر بیٹھتے تھے تاکہ درمیان میں کوئی اور (سچا مسلمان) نہ بیٹھ سکے۔ ایسے الگ حلقے بنا کر محفل کے دوران وہ حضور ﷺ کے فرمودات پر اپنی مرضی کے تبصرے کرتے اور استہزائیہ

فقرے چست کرتے رہتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ عمومی ہدایت جاری کی گئی کہ محفل میں حلقے بنا کر بیٹھنے کے بجائے کھل کر بیٹھا کرو تا کہ معلوم ہو کہ یہ ایک اجتماع ہے۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾ ''اور جب کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جایا کرو'' اس حکم کا باعث بھی منافقین کا طرزِ عمل ہی تھا۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ وہ مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے محوِ گفتگو رہتے تھے۔ فرض کریں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو کسی ضروری مشورے کے لیے بلایا۔ اس پر سب لوگ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے' ضروری گفتگو ہوئی اور صلاح و مشورے کا مرحلہ طے ہو گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ محفل کو برخاست کرنے کا حکم دے کر وہاں سے تشریف لے گئے اور آپؐ کے حکم پر سب مسلمان بھی چلے گئے' مگر یہ منافقین ہیں کہ ابھی بھی ٹولیوں کی صورت میں اسی جگہ پر بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کی یہ حرکتیں نہ صرف اجتماعیت کے نظم وضبط کے خلاف تھیں بلکہ اس سے بہت سی غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔ اس لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کا کہہ دیا جائے تو وہاں سے اٹھ جایا کرو۔

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ ''اللہ بلند فرما دے گا ان لوگوں کے درجات جو تم میں سے واقعی ایمان والے ہیں اور جن کو حقیقی علم عطا ہوا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾﴾ ''اور تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

آیات ۱۲' ۱۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

آیت ۱۲ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب تم رسول (ﷺ) سے تخلیہ میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس بات چیت سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔''

اس حکم کا پس منظر یہ ہے کہ منافقین میں سے اکثر لوگ وقتاً فوقتاً بلاوجہ حضور ﷺ سے تخلیہ میں بات کرنے کا تقاضا کرتے تھے۔ حضور ﷺ مروّت کے باعث ہر کسی کی بات مان تو لیتے' لیکن منافقین کا یہ طرزِ عمل آپؐ کے لیے زحمت کا باعث تھا۔ یہ لوگ حضور ﷺ سے ایسی ملاقاتیں محض اپنی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے کرتے تھے' تا کہ لوگ دیکھیں کہ حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے والا یہ شخص حضور ﷺ کے بہت قریب ہے اور حضور ﷺ کو اس پر بہت اعتماد ہے۔ جیسے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کا معمول تھا کہ حضور ﷺ جب خطبہ جمعہ کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ محض اپنی چودھراہٹ جتانے کے لیے فوراً اگلی صف میں کھڑا ہو جاتا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا کہ لوگو! یہ اللہ کے رسولؐ ہیں' ان کی بات غور سے سنو! یہ شخص مدینہ کے سب سے بڑے قبیلے خزرج کا سردار تھا۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل اہلِ مدینہ کا اتفاق ہو چکا تھا کہ مدینہ میں ایک مستحکم ریاستی نظام قائم کیا جائے تا کہ روز روز کی جنگوں اور باہمی خون ریزی سے ان کی جان چھوٹ جائے۔ اس کے لیے عبداللہ بن اُبی کو بادشاہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اس کے لیے تاج بھی تیار ہو چکا تھا۔ بس رسم تاجپوشی کا انعقاد باقی تھا کہ حضور ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور آتے ہی مدینہ کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔ اس طرح آپ ﷺ کی وجہ سے عبداللہ بن اُبی کی بادشاہت کا خواب ناتمام رہ گیا۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے اُس نے ظاہری طور پر تو مسلمانی کا لبادہ اوڑھ لیا لیکن عمر بھر حضور ﷺ کی مخالفت کا کوئی موقع اُس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بہرحال حالات کی مجبوری تھی کہ ایسا شخص بھی حضور ﷺ سے اپنی قربت جتلانے اور اپنی خصوصی حیثیت نمایاں کرنے کے لیے جمعہ کے اجتماع میں یہ ڈرامہ رچانا ضروری سمجھتا تھا۔

منافقین کے اس طرزِ عمل کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے ذریعے حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے پر ایک طرح کا ٹیکس عائد کر دیا کہ اگر تمہارا حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنا ایسا ہی ضروری ہے تو پہلے اپنے مال میں سے کچھ صدقہ دو

اور پھر آ کر اس مقصد کے لیے حضور ﷺ سے وقت مانگو۔ منافقین چونکہ انفاق سے گھبراتے ہیں اس لیے اس حکم کے بعد ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست نہ کی۔ یہ حکم البتہ بہت تھوڑی دیر نافذ رہا اور جلد ہی اسے اگلی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں واحد شخص تھا جس نے اس حکم پر عمل کیا اور صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست کی۔

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ﴾ ''یہ تمہارے لیے بہتر بھی ہے اور زیادہ پاکیزہ بھی۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢﴾﴾ ''البتہ اگر تم (صدقہ دینے کے لیے) کچھ نہ پاؤ تو اللہ بہت بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی غریب اور نادار لوگ اس حکم پر عمل نہیں بھی کر سکتے تو کوئی مضائقہ نہیں' اللہ تعالیٰ ان کا عذر قبول فرماتے ہوئے انہیں معاف فرمائے گا۔ لیکن ظاہر ہے جن لوگوں کی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا وہ تو سب کے سب متموّل' مرفّہ الحال اور بڑے لوگ تھے جو حضور ﷺ سے اپنی قربت جتلا کر لوگوں کے سامنے مزید ''بڑے'' بننا چاہتے تھے۔

آیت ۱۳ ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ﴾ ''کیا تم ڈر گئے اس سے کہ (رسولؐ کے ساتھ) اپنی تنہائی کی باتوں سے پہلے صدقات پیش کرو؟''

﴿فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''پھر جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے بھی تم پر نظرِ عنایت فرما دی''

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ﴾ ''تو بس نماز قائم رکھو' زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو۔''

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٣﴾﴾ ''اور اللہ باخبر ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

اس آیت کے ذریعے اس حکم کو جلد ہی منسوخ بھی کر دیا گیا' لیکن اس حکم سے ان لوگوں کی قلعی کھل گئی جو محض ریاکاری کے لیے حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کے شوقین تھے۔ پہلے تو وہ اس مقصد کے لیے بار بار حضور ﷺ کے پاس آتے تھے' لیکن صدقہ کے حکم کے بعد

ان میں سے کسی کو بھی علیحدگی میں بات کرنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ بہرحال مذکورہ حکم کے بعد جب ان میں سے کوئی شخص بھی صدقہ دے کر حضور ﷺ سے علیحدگی میں بات کرنے کی درخواست لے کر نہ آیا تو اس حکم کی منسوخی کے بعد اپنا پرانا طرزِ عمل دہراتے ہوئے وہ شرم تو محسوس کرتے ہوں گے اور یہی دراصل اس وقتی اور عارضی حکم کا اصل مقصد تھا۔

آیات ۱۴ تا ۲۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ
مِّنْكُمْ وَ لَا مِنْهُمْ ۙ وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤﴾
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾
اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ﴿١٦﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ
شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ
اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى
شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿١٨﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ
فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ
الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ
اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ﴿٢٠﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿٢١﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ
الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ
اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ
الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ
اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٢٢﴾

آیت ۱۴ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ’’کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں (کے طرزِ عمل) پر جنہوں نے دوستی گانٹھی ہے ان لوگوں سے جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔‘‘

اللہ کے غضب کے حوالے سے یہاں قومِ یہود (مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ) کی طرف اشارہ ہے اور ان سے دوستیاں گانٹھنے والے اوس اور خزرج کے منافقین تھے جو اُن کے ساتھ اپنے پرانے حلیفانہ تعلقات کو ابھی تک نباہے چلے جا رہے تھے۔

﴿مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ﴾ ’’نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ اُن میں سے ہیں‘‘

منافقین کے اس دوغلے کردار کا ذکر سورۃ النساء (آیت ۱۴۳) میں اس طرح ہوا ہے: ﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ﴾ ’’نہ تو یہ اِن کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں۔‘‘

﴿وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ ’’اور وہ جانتے بوجھتے جھوٹ پر قسمیں اٹھاتے ہیں۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ﴾ ’’اللہ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے سخت عذاب۔‘‘

﴿اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ’’یقیناً بہت ہی بُرا ہے وہ طرزِ عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ ’’انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے‘‘

یہ لوگ جھوٹی قسموں کو اپنی کمزوریوں کی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جہاں کہیں کسی کی کسی بات پر گرفت ہوتی‘ وہ فوراً قسمیں کھانا شروع کر دیتا کہ اللہ کی قسم اصل میں یہ معاملہ یوں نہیں تھا بلکہ یوں تھا۔ اس طرح اُس کا مخاطب مروّت میں آ کر خاموشی اختیار کر لیتا۔

﴿فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾﴾ ’’پس وہ اللہ کے راستے سے رک گئے ہیں (اور دوسروں کو بھی روکتے ہیں) پس ان کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔‘‘

صَدَّ يَصُدُّ کے معنی خود رکنا بھی ہیں اور دوسروں کو روکنا بھی۔

آیت ۱۷ ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ﴾ ’’اُن کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اُن کے اموال اور نہ ہی اُن کی اولادیں اللہ سے بچانے کے لیے۔‘‘

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’یہ آگ والے ہیں‘ اسی میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔‘‘

مقامِ عبرت ہے کہ یہ ’’نوید‘‘ ان لوگوں کو سنائی جا رہی ہے جو بظاہر حضور ﷺ کے ماننے والے تھے‘ آپ ﷺ کی اقتدا میں نمازیں پڑھتے تھے‘ اسلام کا دم بھرتے تھے‘ خود کو مسلمان کہتے تھے اور زبانوں سے گواہی دیتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ سورۃ المنافقون کی پہلی آیت میں ان کی اس ’’شہادت‘‘ کا خصوصی طور پر ذکر کر کے ان کے جھوٹے ہونے پر مہر ثبت کی گئی ہے: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں‘ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ﴾ ’’جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اُس کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے جیسے (آج) تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں‘‘

یعنی یہ لوگ جھوٹی قسمیں کھانے کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ عزّوجل کے سامنے بھی اسی طرح جھوٹی قسمیں کھانا شروع ہو جائیں گے کہ ہم ایسے نہیں کہتے تھے اور ہم ویسے نہیں کرتے تھے۔

﴿وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ﴾ ’’اور وہ سمجھیں گے کہ وہ کسی بات پر ہیں۔‘‘

اللہ کی عدالت میں کھڑے ہو کر بھی وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہمارے اعمال کی بھی کچھ نہ کچھ حیثیت تو ہے۔ آخر ہم مسلمان ہوئے تھے‘ ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کی اقتدا میں نمازیں پڑھی تھیں‘ روزے رکھے تھے‘ سب مسلمانوں کے ساتھ مل کر مہمّات میں حصّہ لیتے رہے تھے۔ اس طرح ہم دنیا سے کچھ نہ کچھ نیک اعمال تو لے کر آئے ہی ہیں۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝١٨﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’شیطان نے ان کے اوپر قابو پالیا ہے‘ پس انہیں اللہ کی یاد بھلا دی ہے۔‘‘

شیطان اُن پر مسلّط ہو چکا ہے اور اُس نے انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ﴾ ’’یہ لوگ ہیں شیطان کی جماعت۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شیطان کی یہ جماعت تین گروہوں پر مشتمل تھی۔ ان میں شیطان کا سب سے طاقتور ہتھیار مشرکینِ عرب تھے۔ انہوں نے اسلام کی مخالفت اور اپنے ’’دین‘‘ کی حمایت میں ہر طرح کی قربانیاں دیں‘ جنگیں بھی لڑیں اور اپنے باطل معبودوں کے لیے گردنیں بھی کٹوائیں۔ دوسرا گروہ یہودِ مدینہ کا تھا‘ جبکہ تیسرا گروہ منافقین پر مشتمل تھا۔ منافقین مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے ان کے خلاف fifth columnists کا کردار ادا کر رہے تھے۔ آیات زیر مطالعہ میں خصوصی طور پر ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ اگرچہ خود کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں بیٹھے ہیں‘ لیکن اصل میں یہ حزب الشیطان ہی کے ارکان ہیں۔ مسلمانوں کی مخالفت کے حوالے سے ان لوگوں کے کردار کی مزید تفصیل اگلی سورۃ یعنی سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے۔

﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝١٩﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! شیطان کی جماعت کے لوگ ہی حقیقت میں خسارہ اٹھانے والے ہیں۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ۝٢٠﴾ ’’یقیناً جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مخالفت پر تُلے بیٹھے ہیں‘ وہی ذلیل ترین لوگوں میں سے ہوں گے۔‘‘

ذِلّت کے ذکر کے لیے اَذَلِّیْن (ذلیل ترین) یہاں ’’تفضیلِ کُل‘‘ (superlative degree) کے طور پر آیا ہے۔ سورۃ النساء کی اس آیت میں بھی منافقین کے لیے بالکل یہی اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝١٤٥﴾ ’’یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے‘ اور تم نہ پاؤ گے ان کے لیے کوئی مددگار۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ﴾ ’’اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً مَیں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔‘‘

مَیں اور میرے رسول لازماً غالب ہو کر رہیں گے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الصافات کی ان آیات میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝١٧١ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝١٧٢ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝١٧٣﴾ ’’اور ہماری یہ بات پہلے سے طے شدہ ہے اپنے اُن بندوں کے لیے جن کو ہم (رسول بنا کر) بھیجتے رہے ہیں‘ کہ اُن کی لازماً مدد کی جائے گی‘ اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔‘‘

اس بارے میں قبل ازیں بھی متعدد بار ذکر ہو چکا ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ یہ مضمون بھی اسی اصول کے تحت سورۃ الصافات کے بعد یہاں پھر آیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝٢١﴾ ’’بے شک اللہ زبردست ہے‘ زور آور ہے۔‘‘

حزب الشیطان کے ذکر کے بعد فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر اب اگلی آیت میں حزب اللہ کا ذکر ہے۔ یہ آیت حزب اللہ کی رکنیت کے معیار کے حوالے سے litmus test بھی ہے۔ اس ٹیسٹ کا تعلق انسان کے قلبی تعلقات اور قریبی رشتوں سے ہے۔ اگر کسی مسلمان کا کوئی رشتہ دار‘ چاہے وہ اُس کا باپ‘ بیٹا یا بھائی ہی کیوں نہ ہو‘ کافر و مشرک ہے اور وہ اسلام کی مخالفت میں باقاعدہ سرگرمِ عمل ہے‘ تو اُس مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اُس کے ایمان کی تلوار اس دشمنِ خدا کے ساتھ موجود اپنے رشتے کو کاٹ پھینکے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور کسی ایسے فرد کے ساتھ اس کے قلبی تعلق کا پیوند بدستور اُستوار رہا جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہے تو ایسا مسلمان حزب اللہ سے خارج سمجھا جائے گا۔

آیت ۲۲ ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ’’تم نہیں پاؤ گے اُن لوگوں کو جو حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یومِ آخرت پر کہ وہ محبّت کرتے ہوں اُن سے جو مخالفت کر رہے ہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی‘‘

یہ حکم ان کُفّار و مشرکین کے لیے ہے جو اسلام کی مخالفت میں فعال (active) اور سرگرمِ عمل ہوں۔ جہاں تک ان کُفّار و مشرکین کا تعلق ہے جو ایسی کسی جِدّ و جُہد میں بالفعل فعال نہ ہوں‘

ان کے بارے میں حکم آگے سورۃ الممتحنہ میں آئے گا۔

﴿وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ﴾ ''خواہ وہ اُن کے باپ ہوں یا اُن کے بیٹے ہوں یا اُن کے بھائی ہوں یا اُن کے رشتے دار ہوں۔''

آیت کا یہ حصّہ پڑھتے ہوئے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ کا مضمون بھی ذہن میں تازہ کرلیں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)' تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں' اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے' اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں' (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ' اُس کے رسولؐ اور اُس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

ان آیات کا پیغام بہت واضح ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے ایک بندۂ مسلمان کی محبّت کا اصل امتحان عشقِ رسول ﷺ کے زبانی دعوے اور نعتیہ اشعار میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے نہیں' بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے ہوگا۔ اگر تو وہ اس آیت میں مذکور اپنی آٹھ محبتوں کو تج کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے کمربستہ ہے تو وہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبّت میں سچا ہے' لیکن اگر وہ اس کے لیے عملاً تیار نہیں ہے تو اس کے زبانی دعووں کی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے''

دلوں کے اندر ایمان لکھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان پختہ کر دیا ہے۔ یعنی ایمان اب اُن کے دلوں میں نقش کالحجر (پتھر پر لکیر) کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

﴿وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ﴾ ''اور اُس نے اُن کی مدد کی ہے اپنی طرف سے روح کے ساتھ''

روح سے مراد یہاں فرشتہ بھی ہوسکتا ہے' الہام بھی ہوسکتا ہے اور اللہ کا خصوصی فضل بھی ہوسکتا ہے۔ غرض اللہ کی طرف سے غیر مرئی انداز میں مدد کی کوئی صورت بھی ہوسکتی ہے۔

﴿وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ﴾ ''اور وہ داخل کرے گا انہیں اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ﴾ ''اللہ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اُس سے راضی ہوگئے۔''

اس کا ترجمہ ایسے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ''اللہ اُن سے راضی ہوجائے گا اور وہ اُس سے راضی ہوجائیں گے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''یہ لوگ ہیں اللہ کی جماعت!''

﴿اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''آگاہ ہوجاؤ! یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔''

سورۃ المائدۃ میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾﴾ کہ یقیناً اللہ کی جماعت کے لوگ ہی غالب رہنے والے ہیں۔ اگر حزب اللہ کی جدّوجُہد کے نتیجے میں اللہ کا دین دنیا میں غالب ہوجاتا ہے تو یہ یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ لیکن اصل اور حقیقی کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے' جس کی بشارت ''حزب اللہ'' والوں کو اس آیت میں دی جارہی ہے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمین یارَبَّ الْعَالمین! ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

منصبِ اِمامت اور اُس کے تقاضے

حافظ عاطف وحید*

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور میں ۵ نومبر ۲۰۲۱ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚۖ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾﴾ (الحج)

آج کی نشست کا عنوان ہے: ''منصبِ اِمامت اور اس کے تقاضے۔'' گویا ہمیں دو پہلوؤں کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ ایک یہ کہ قرآن حکیم کی رو سے منصبِ اِمامت سے کیا مراد ہے۔ دوسرے یہ کہ منصبِ اِمامت پر فائز قوموں اور اُمّتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کون سے تقاضے عائد کیے گئے ہیں جنہیں ادا کرنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے دو مقامات سے قرآن کی آیات تلاوت کی گئی ہیں۔ ایک سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ کا کچھ حصہ اور اس کے بعد سورۃ الحج کی آخری دو آیات۔

* ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بہت شان و شوکت کے ساتھ بار بار آیا ہے۔ اسی ذیل میں سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ﴾ (آیت ۱۲۴)

''جب ابراہیم کو اُس کے رب نے آزمایا بعض بڑی بڑی باتوں میں تو ابراہیم نے ان سب کو پورا کر دکھایا۔''

آپؑ ان تمام آزمائشوں میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے' کامیابی سے گزر گئے۔

﴿قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾

''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: (اے ابراہیم!) مَیں تمہیں لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں (یا امام بناتا ہوں)۔''

﴿قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ﴾

''(انہوں نے اللہ سے) دریافت کیا: کیا یہ وعدہ میری ذُرّیت کے حق میں بھی ہے؟''

کیا وہ بھی منصبِ اِمامت پر فائز رہیں گے جیسے تُو نے مجھے لوگوں کے لیے امام بنا دیا؟ اس کا جواب بہت ہی دلچسپ اور پُرحکمت ہے۔

﴿قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾

''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: میرا یہ عہد (یا میرا یہ وعدہ) ظالموں کے حق میں پورا نہیں ہوگا۔''

یعنی ظالم لوگ امام نہیں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے القابات سے نوازا ہے' جن میں سے ایک بہت خوبصورت لقب ''امام الناس'' بھی ہے۔ امام' اِمامت' اُمّت سب کے سب بہت قریب کے الفاظ ہیں اور ان کا اصل مادہ بھی ایک ہی ہے۔ منصبِ اِمامت کا عرف میں معنی ہے: قوموں کی سرداری' قوموں کی سربراہی۔ امام اسے کہتے ہیں جو آگے ہوتا ہے' جو سربراہ ہوتا ہے' جو سردار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ انسانوں کی سرداری ایک منصب ہے جو اللہ کے ہاں طے ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی اپنی ایک پسند ہے کہ وہ منصبِ اِمامت کسے بخشتا ہے۔ یہ کوئی کسبی شے نہیں ہے کہ کوئی آدمی اس کے لیے کوئی ریاضیت یا چِلّہ کشی کرے اور نتیجتاً امام بن جائے۔ منصبِ اِمامت اس طرح سے حاصل ہونے والی شے نہیں ہے' بلکہ یہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وہبی شے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو اندازہ نہیں ہوگا کہ انہیں اتنے بڑے منصب سے سرفراز کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب آپؑ اس منصب پر سرفراز ہو گئے تو گویا انہیں اب یہ احساس ہوا کہ یہ منصب بغیر ذمہ داریوں کے تو نہیں ہو سکتا۔ امام الناس کا رتبہ کسی اعزاز سے کم نہیں ہے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سے مناصب اور القابات سے نوازا ہے۔ آپ علیہ السلام خلیل اللہ ہیں' ابوالانبیاء ہیں' لیکن امام الناس کا منصب براہِ راست بعض ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہٰذا انہیں اپنی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر پڑ گئی۔

اس منصب کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت یا دین' دینِ توحید' ہے۔ ملّتِ ابراہیمی کا یہ علمی ورثہ آئندہ نسلوں کے لیے بہت بڑی فضیلت کی شے ہے اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ دنیا میں جو بڑے علمی خانوادے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کی بڑی سرفرازی رکھی ہے۔ لوگوں میں ان کا ادب واحترام ہوتا ہے۔ پھر ان کی ذریت چاہے صلبی ہو یا معنوی' ان کا بھی ایک خاص ادب واحترام رہتا ہے۔ تو ایک ہے ملّتِ ابراہیمی کا تراث علمی والا پہلو کہ اب تم اس کے جانشین اور وارث ہو۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء پیدا کیے جو اسی پیغام کے حامل تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا' اور جس کے آپؑ مبلغ اور پرچارک تھے۔ آپؑ نے ساری زندگی اسی کی دعوت وتبلیغ میں گزار دی۔

چنانچہ ایک تو علمی پہلو ہے کہ نظریۂ توحید کے اب یہ وارث ہیں اور ان کے اوپر لازم ہے کہ وہ اس نظریئے کو پورے طور سے تھامے رکھیں۔ توحید کے معاملے میں کوئی مداہنت (compromise) نہ کریں۔ دوسرے لوگوں تک اس کا پیغام پہنچانا اب گویا ان کی علمی ذمہ داری ہے۔

دوسرا یہ کہ جن لوگوں کے اندر اس منصب سے وابستہ تمام اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ملّتِ ابراہیمی کا صحیح وارث بننے کی صلاحیت پیدا کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں تمکّن بھی عطا فرماتا ہے۔ اسی لیے بنی اسرائیل کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک حدیث ہے:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ' كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ))

(متفق علیہ)

''بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت وسیادت انبیاء کے ہاتھوں میں تھی' جب بھی کسی نبی کا انتقال ہوتا دوسرا نبی اس کا جانشین بن جاتا۔''

گویا وہ نہ صرف ان کے علمی پیشوا اور مقتدا تھے بلکہ سیاسی معاملات بھی بنی اسرائیل کے انبیاء ہی کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ اسی کو قرآن حکیم تمکّن فی الارض بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں زمین میں اقتدار دے گا' تمہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا۔ اس بارے میں آیت استخلاف ملاحظہ ہو:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠﴾ (النور:۵۵)

''اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا' جیسے اُس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی۔''

چنانچہ ان دونوں پہلوؤں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ''امام الناس'' بنایا ہے کہ وہ مقتدا اور پیشوا ہیں۔ ان کی علمی وراثت کو آگے چلانے کا سلسلہ انہی کی نسل میں ہوگا۔ اور جو ملّتِ ابراہیمی کے وارث بننے کا حق ادا کریں گے انہیں تمکن فی الارض بھی عطا ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں (حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام) سے دو نسلیں چلی ہیں۔ ایک حضرت اسحاق علیہ السلام' پھر ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام' اور پھر ان کے آگے کتنے ہی انبیاء ورسلؑ جن میں سے قرآن حکیم میں بعض کا ذکر بھی ہے اور بہت سے وہ ہیں جو مذکور نہیں ہیں۔ یہ بنی اسرائیل ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص پہلو سے فضیلت عطا کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ارضِ فلسطین سے جہاں وہ آباد تھے' بیت اللہ شریف کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ آپؑ وہاں سے اپنے شیر خوار صاحب زادے حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ جو مصر کے ایک بادشاہ کی بیٹی تھیں' اور بڑے ناز ونعم میں پلی تھیں' ساتھ لے کر چلے۔ حکم ہوا کہ اپنی ذریت کو ایک ایسی وادی میں لے جا کر آباد کرنا ہے جہاں کوئی کھیتی نہیں اُگتی' جہاں کسی پھل کی پیداوار نہیں ہوتی۔ سوائے کچھ جھاڑ جھنکاڑ کے' اور کچھ بھی نہیں ہے (بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ)۔ اگرچہ اس علاقے میں کچھ جگہیں ایسی تھیں جہاں کہیں کہیں کھجوروں کے باغات تھے' لیکن جس جگہ اتارنے کا حکم ہوا وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا' پانی بھی

نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس کٹھن امتحان سے پیش نظر یہ تھا کہ یہ جگہ جو دنیا کا مرکز بھی ہے اور اس زمین کا بھی' یہاں پر بیت اللہ شریف کی ازسرِ نو تعمیر ہو اور اسے مرکزِ توحید بنایا جائے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾﴾ (البقرۃ)

''اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر (بیت اللہ) کو قرار دے دیا لوگوں کے لیے اجتماع (اور زیارت) کی جگہ اور اُسے امن کا گھر قرار دے دیا۔ اور (ہم نے حکم دیا کہ) مقامِ ابراہیمؑ کو اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔ اور ہم نے حکم کیا تھا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہ تم دونوں میرے اس گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔''

یعنی ان تمام لوگوں کے لیے جو طواف کے لیے آئیں اور رکوع و سجود کریں' قیام کریں' طواف کریں' ان سب کے لیے اس گھر کو پاک صاف رکھا جائے اور اسے توحید کا مرکز بنا دیا جائے۔ یہیں سے توحید کا نور چہار دانگ عالم میں پھیلایا جائے۔ یہاں پر ایک ایسی قوم آ کر آباد ہو جو ملّتِ ابراہیم کی صحیح وارث بنے۔ یہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نسل کی خاص فضیلت۔

لیکن ہوا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے جو حاملینِ شریعت تھے (بنی اسرائیل) وہ اپنے اس تراثِ علمی کو بھول چکے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے ہاں طرح طرح کی بدعقیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں' حتیٰ کہ شرک داخل ہو چکا تھا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ﴾ (التوبۃ:۳۰)

یعنی یہود کو خیال ہو گیا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔ جہاں اس قسم کی بدترین شرک کی کیفیت پیدا ہو جائے تو گویا وہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑ گیا۔ چنانچہ توہمات بھی آ گئے' دنیاداری بھی آ گئی' مال سے محبت بھی آ گئی' فتویٰ فروشیاں بھی آ گئیں۔ اس اعتبار سے یہود و نصاریٰ یعنی بنی اسرائیل کا وہ سلسلہ جو حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلا تھا' انہوں نے justify کر دیا کہ ہم ملّتِ ابراہیمی کی ذمہ داریوں کے لیے نااہل ہیں۔ جس فضیلت کے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں مامور رکھا تھا' اب ہم اس کے اہل نہیں رہے۔

دوسری طرف بنی اسماعیل کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ وہ سمجھتے تو یہی تھے کہ ہم بھی ملّتِ ابراہیمی پر قائم ہیں۔ قریش کے سارے سردار بیت اللہ کے متولی تھے اور ان میں سے بعض خاندان خاص طور سے بیت اللہ شریف کے کلید بردار بھی تھے اور اس کی ساری ذمہ داریاں ادا کرتے تھے۔ لیکن بیت اللہ شریف کا حال یہ تھا کہ وہاں سے بھی توحید کا نظریہ اُٹھ چکا تھا۔ ۳۱۳ بُت تو عین بیت اللہ شریف کے اندر نصب کیے ہوئے تھے۔ طرح طرح کی بدعقیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ علمی طور پر بہت ہی عجیب و غریب قسم کی موشگافیاں بھی تھیں۔ آخرت کے بارے میں یہ تصور نکل چکا تھا کہ وہاں حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہو گا۔ وہ برملا کہتے تھے کہ اول تو یہ ہونے والی بات لگتی ہی نہیں ہے کہ کوئی بعث بعد الموت ہو گا۔ ہم دیکھ رہے کہ مُردے مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں' ذرّہ ذرّہ منتشر ہو جاتا ہے' اس کے بعد بچتا ہی کچھ نہیں' تو کیسے دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟

﴿هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾﴾ (المؤمنون)

''ناممکن! بالکل ناممکن ہے یہ بات جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے! یہ کچھ نہیں ہے مگر بس ہماری دنیا کی زندگی (ہی اصل زندگی) ہے' ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ رہتے ہیں' اور ہم (دوبارہ) اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

دوسرا یہ کہ اگر کہیں یہ ہو بھی گیا تو اتنی دیویاں' دیوتا کہاں اور کب کام آئیں گے! ہم ان کی نذر نیاز مانتے ہیں' منتیں مانگتے ہیں' ان کے نام پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں' تو آخر یہ اسی لیے ہے کہ وہاں پر اگر اللہ کی پکڑ ہو گئی تو پھر یہ کام آئیں گے۔

یہ حالات تھے جن میں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ سورۃ الحج کی آیات جن کی آغاز میں تلاوت کی گئی ہے' اس لحاظ سے بہت اہم ہیں کہ یہ مکّی دور کے بالکل آخر میں نازل ہونے والی آیات ہیں۔ اس کے بعد اس سورت میں کچھ آیات وہ بھی ہیں جو مدنی ہیں' یعنی ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ تو ایک طرح سے یہ سورۂ مبارکہ مکّی اور مدنی آیات کا مجموعہ ہے اور اس سورۃ کا مزاج مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔ چنانچہ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ قریش کے سردار بھی اور یہود و نصاریٰ بھی خائن' غدار اور بدعہد ہیں۔ وہ منصبِ اِمامت کی

ذمہ داریاں بھول چکے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر عائد کی تھیں۔ لہٰذا اب یہ اس منصب سے معزول کیے جاتے ہیں۔ یہ معزول ہوئے ہیں تو حق دار وہ بنائے جا رہے ہیں جو آج شدید ترین مصیبتوں سے دوچار کیے جا رہے ہیں: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ (الفتح: ۲۹) وہ ہیں ملّتِ ابراہیمی کے اصل وارث۔ انہیں یہاں پر اذیتیں دی جا رہی ہیں' تکلیفیں دی جا رہی ہیں' یہاں تک کہ انہیں ہجرت پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ آج تک تو اللہ تعالیٰ نے ان مظلوموں کے ہاتھ باندھے رکھے ہیں کہ یہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کا جواب نہ دیں۔ لیکن اسی سورۂ مبارکہ کے اندر وہ آیات بھی آ گئیں جس میں بتا دیا گیا کہ enough is enough' اب اس کے بعد اور نہیں! اسی سورت میں وہ آیات نازل ہوئیں کہ جن لوگوں پر جنگ مسلّط کی گئی ہے ان کو اللہ کی طرف سے اجازت دے دی گئی' ان کے ہاتھ کھول دیے گئے۔ اس لیے کہ یہ تو ہمیشہ سے ضابطہ ہے کہ جو ظلم کرے گا اس کا بدلہ حق ہے۔ جن پر ظلم ہوا ہے وہ اپنا بدلہ لیں۔ لہٰذا اب یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ۝۳۹ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ﴾ (الحج)

''اب اجازت دی جا رہی ہے (قتال کی) ان لوگوں کو جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے' اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور یقیناً اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے صرف اس (جرم) پر کہ انہوں نے کہا: ہمارا ربّ اللہ ہے!''

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تحریک میں جو نیا موڑ شروع ہونے والا تھا اس میں اقدام اور مسلح تصادم ناگزیر تھا۔ چنانچہ اذنِ قتال کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکّہ کی طرف فوجی مہمات بھیجنا شروع کر دیں۔ واضح رہے کہ آپؐ نے غزوۂ بدر سے قبل ایسی آٹھ فوجی مہمات روانہ فرمائیں' جن میں سے چار میں حضور اقدس ﷺ بنفسِ نفیس شریک ہوئے۔ مشرکینِ مکّہ نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کے ہاتھ بھی کھل گئے ہیں اور ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اہلِ ایمان کے اوپر بڑی جنگ مسلط کر کے انہیں ختم ہی کر دو۔ اسی آیۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ اگر جنگ کی گئی تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد اور نصرت پر قادر ہے۔ نیز فرمایا: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۴۰﴾

(الحج) ''اور اللہ لازماً اُس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ طاقت ور ہے' زبردست ہے۔'' گویا جو ظالم ہیں' غدار اور خائن ہیں وہ شکست سے دوچار ہوں گے' چاہے اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھتے ہوں۔ جن حالات میں یہ آیات نازل ہو رہی ہیں وہ مسلمانوں کے حق میں نہیں تھے۔ وہ تو ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔ کتنی بڑی بات ہے اپنا آبائی گھر چھوڑنا' اپنے مال ومتاع سے دست بردار ہونا' اپنی جائیدادوں سے نکل جانا۔ پھر ایک ایسے علاقے کی طرف چلے جانا جہاں پر کچھ پتا نہیں کہ کچھ کھانے کو بھی ملے گا یا نہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مکّہ میں بیت اللہ شریف کا قرب ہمیں حاصل تھا' آج ہمیں اس سے بھی محروم ہونا پڑ رہا ہے۔ ہجرت کر کے جانے والوں کے دِل کی کیا کیفیت ہوگی! رسول اللہ ﷺ پر کیا بیت رہی ہوگی جب حکم آیا کہ ہجرت کر جاؤ! اس پہلو سے خائن اور غدار سردارانِ قریش' کُفّارِ مکّہ اور دوسری طرف یہود و نصاریٰ کی معزولی کا بیان انہی آیات میں ہے۔ ان کی جگہ یہ منصب امامت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کے حوالے کر دیا۔ یہ ہے منصب امامت سے معزولی اور سرفرازی کا فلسفہ!

قرآن مجید میں کم سے کم دو مقامات پر بڑی وضاحت سے یہ آیات آئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں تحویلِ قبلہ کی مناسبت سے یہ آیات آئی ہیں کہ تحویلِ قبلہ بھی ایک علامت تھی کہ پچھلی اُمّت کی معزولی کی گئی اور ان کا قبلہ اب مسلمانوں کا قبلہ نہیں ہے۔ اے مسلمانو! اب تمہارا رُخ اس طرف نہیں ہونا چاہیے' بلکہ قبلہ وہی ہے جو پہلے دن سے اللہ نے مقرر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۶﴾

(آل عمران)

''یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا (اللہ کی عبادت کے لیے) وہی ہے جو مکّہ میں ہے اور باعثِ ہدایت ہے تمام جہان والوں کے لیے۔''

وہ ہے اصل قبلہ' لہٰذا تحویلِ قبلہ ہو گیا۔ یہ تحویلِ قبلہ تو ہجرت کے تقریباً ایک سال بعد غزوۂ بدر سے چند مہینے پہلے ہو رہا ہے۔ اس کے بعد غزوۂ بدر ہوا جس کے اندر اللہ نے حق کا بول بالا کیا۔ چند مسلمانوں کے ہاتھوں ایک بڑے لشکر کو شکست دلا دی۔ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ اللہ نے نصرت کے جو وعدے کیے تھے وہ اب پورے ہو رہے ہیں۔ اس تناظر میں اب مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ چونکہ اب تم ملّتِ ابراہیمی کے وارث بنائے گئے ہو اور بیت اللہ شریف کے

متولی بنائے جا رہے ہو تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کمزوری دکھاؤ۔ اب تمہارے اندر کیا صفات پیدا ہونی چاہئیں اور تمہیں کون سے تقاضے ادا کرنے ہیں' یہ ہے ان آیات کا موضوع۔

چنانچہ سورۃ الحج میں فرمایا کہ سب سے پہلے تم اپنے اخلاقی اور روحانی وجود کو مضبوط بناؤ۔ اس کے بغیر خارج میں تم کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکو گے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۷۷﴾

''اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی بندگی کرو اور نیک کام کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔''

یہ رکوع اور سجدہ نماز کے ارکان ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ قرآن مجید کی ایک مستقل اصطلاح ہے' پھر یہاں رکوع اور سجدہ الگ سے کیوں بیان ہوا؟ قرآن حکیم میں جہاں بھی نماز کے اجزاء کا ذکر آتا ہے وہاں پابندیٔ اوقات کے ساتھ ساتھ نماز کے اندر حد درجے مشغولیت اور انہماک کی تاکید کے لیے یہ اسلوب بیان لایا جاتا ہے۔ مثلاً: ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲﴾ (المزمل) ''آپؐ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔'' قیام نماز کا جزو ہے' لیکن رسول اللہ ﷺ کو قیام کا الگ سے حکم آیا۔ اسی طرح رکوع اور سجدہ نماز کے اجزاء ہیں لیکن رکوع اور سجدے میں جو شغف اور انہماک ہونا چاہیے اس کی اہمیت کے پیش نظر یہاں ان اجزاء کا ذکر ہے۔ مزید برآں یہ بھی مفہوم میں شامل ہے کہ کچھ خلوت کی نمازیں بھی ہیں جن کا تمہیں خصوصیت سے اہتمام کرنا ہے۔ جن ذمہ داریوں کا تم پر بار ڈالا گیا ہے ان کی ادائیگی کے لیے تیاری درکار ہے' وہ تیاری ایسے نہیں ہوگی۔ ﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶﴾ (المزمل) ''یقیناً رات کا جاگنا بہت مؤثر ہے نفس کو زیر کرنے کے لیے اور بات کو زیادہ درست رکھنے والا ہے۔'' یہ جو رات کا اٹھنا ہے' رات کے آخری پہر کی نماز ع ''کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!'' یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ نماز میں کوئی ریاکاری کا امکان نہیں۔ لہٰذا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا —— اے مسلمانو! یہ خاص نمازیں ہیں' خلوت کی نمازیں۔ ان کا شغف اور انہماک کے ساتھ اہتمام کرو تاکہ اپنے آپ کو اخلاقی اور روحانی طور پر تیار کر سکو۔

اس کے بعد: ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ﴾ ''اپنے رب کی بندگی اختیار کرو'' نماز بھی عبادت ہی ہے' رکوع و سجود بھی عبادت ہے' لیکن اگلا حکم آ رہا ہے کہ عبادت کرو! ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ عبادت کا لغوی معنی ہے اللہ کے سامنے حاضر ہونا' فروتنی دکھانا' تذلل اختیار کرنا' اس کے آگے اپنے وجود کو جھکا دینا۔ دین نے اسے مستقل عبادت بنا دیا اور پوری زندگی میں اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جھکانا' اس کی اطاعت کرنا' اس کے احکام کی پیروی کرنا لازم قرار دیا۔ ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ عبادت صرف مسجدوں میں ہی درکار ہے۔ نہیں! یہ عبادت اور اطاعت پوری زندگی میں درکار ہے۔ لہٰذا خاص سے عام کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ رکوع و سجود خاص ہے اور عبادت عام ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ ''اور خیر (بھلائی) کے کام کرو''۔ کیا عبادت خیر کا کام نہیں؟ رکوع و سجود خیر کے کام نہیں؟ پھر مزید حکم کیوں آ رہا ہے۔ دراصل یہ وہ معاملات ہیں جن کا تعلق کسی انسانی شخصیت یا معاشرے کی مضبوطی اور استحکام (maturity) کے ساتھ ہے۔ وہ کام کرنے کا حکم ہو رہا ہے جو دوسروں کی مدد کے ہیں۔ انسان کے اندر ایک پریشانی ہوتی ہے کہ میرے بھائی بند کس حال میں ہیں! اس کے لیے انسان کوششیں کرے' بھاگ دوڑ کرے۔ یہ افعالِ خیر ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے انسان کی شخصیت میں خوبصورتی اور معاشرے میں حسن پیدا ہوتا ہے' معاشرہ مضبوط ہوتا ہے۔ لہٰذا ان تینوں چیزوں کے ذریعے سے ایک بندۂ مؤمن کو حکم ہو رہا ہے کہ اگر اس منصبِ امامت کے تقاضے پورے کرنے ہیں تو خام مال نہ بنو' بلکہ مضبوط رہو۔ یہ تقاضے پورے کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس منصب کے جماعتی اور اجتماعی تقاضے ادا کرنے کی توفیق دے گا۔ اس کے لیے تمہارے اندر قوت پیدا ہوگی۔

اگلی آیت میں اس اجتماعیت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ صرف اپنی ذات کو مانجھا لگانا' اپنی ذات کو ہی اپنی تمام کوششوں کا ہدف بنائے رکھنا کافی نہیں ہے' اب یہ ایک نئی اُمّتِ مُسلمہ اللہ نے برپا کی ہے اور اس کو ''اُمّتِ وَسط'' قرار دیا ہے۔ اللہ کی صراطِ مستقیم کے بیچوں بیچ جو اُمّت کھڑی ہے' اب وہ تم ہو۔ تم بہترین اُمّت ہو' معتدل ترین اُمّت ہو۔ وہ افراط و تفریط جو سابقہ اُمتوں نے اختیار کیے تھے' تمہارے اندر پیدا نہ ہوں۔ اس سارے مقصد کے لیے اب تمہیں ایک اجتماعیت کی ضرورت ہے' اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ

جِهَادِهٖ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کی راہ میں جہاد کا حق ہے''۔ یہاں جہاد عام مفہوم میں ہے۔ ''قتال'' جہاد کی ایک خاص شکل ہے۔ ہر وہ کوشش جو اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے کی جائے' جہاد ہے۔ مسلمانوں کو بحیثیت اُمّتِ مُسلمہ کافر داور رسول اللہ ﷺ کا اُمتی بننے کے لیے جو کوششیں درکار ہیں اور اس کے جو تقاضے ہیں' ان کو ادا کرنا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ قتال اس کی آخری شکل اور آخری منزل ہے جو مشروط بشرائط ہے۔ وہ ہر وقت نہیں ہوتا بلکہ جب اس کا تقاضا ہوتا ہے' جب اس کی ضرورت ہوتی ہے تبھی ہوتا ہے۔ البتہ جہاد ایک مستقل عمل ہے۔ اپنے نفس کے خلاف بھی جہاد ہے اور اللہ کے دین کو پھیلانا بھی جہاد ہے۔ قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا' اس کی دعوت کو' توحید کی دعوت کو دوسروں تک پہنچانا بھی جہاد ہے۔ چونکہ کوئی اور نبی نہیں آنا' لہٰذا اب یہ ذمہ داری اُمّتِ مُسلمہ کی ہے۔ اسی ذمہ داری پر سابقہ امتیں بھی فائز رہی ہیں لیکن وہ معزول کر دی گئیں۔ ان کا یہ انجام بھی بتا دیا گیا کہ:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۶۱)

''اور ان پر ذلت و خواری اور محتاجی و کم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔''

اب یہ اُمّتِ مُسلمہ ہے جو اس کام پر مامور ہے۔

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ہے''۔ بڑا سخت اسلوب ہے۔ یہاں کوئی نیم دلانہ کوشش درکار نہیں۔ مارے باندھے کی کوشش مطلوب نہیں ہے۔ اس کے لیے جان کی بازی بھی لگانی پڑے تو اس سے بھی تمہیں کنارہ نہیں کرنا۔ عزم بالجزم کے ساتھ اللہ کے اس دین کا پرچم اب تمہیں سنبھالنا ہے' تھامنا ہے۔ یہ ہے تمہارا فرضِ منصبی۔ اسی کی وجہ سے تم خیر اُمّت ہو۔

﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ''اُس نے تمہیں چن لیا ہے''۔ اُسی اللہ نے تمہیں چنا ہے جس نے تمہیں جہاد کا حکم دیا ہے۔ وہی تمہارا رب ہے جس نے تمہیں اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ ذرا اپنی قدر تو پہچانو۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا کہ ع ''اپنی خودی پہچان' او غافل افغان!'' وہی بات یہاں کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! ذرا اپنی قدر و منزلت تو پہچانو' اللہ نے تمہیں منتخب کیا ہے۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ''اور اُس نے اس دین میں تم پر

کوئی تنگی نہیں رکھی''۔ دین کا کوئی تقاضا ایسا نہیں ہے جو فطرت کے خلاف ہو۔ کوئی پابندی ایسی نہیں ہے کہ جس کو تم قبول نہ کر سکو۔ یہ تمہاری اپنی حد استطاعت کے اندر ہے۔ جو حکم آ رہا ہے اسے پورا کرنے کی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر پیدا کی ہیں۔ بعض ایسی سختیاں جو سابقہ شریعتوں میں تھیں' اللہ نے وہ بھی تم سے اٹھا لیں۔

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ﴾ ''یہ تمہارے جدِّ امجد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی ملّت ہے''۔ ان کا طریقہ ہے' تمہیں اس پر فخر کرنا چاہیے۔ اپنے آباء و اَجداد خاص طور پر اگر وہ انبیاء بھی ہوں' ان کی ملّت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم ان کے نقش قدم پر چلو جبکہ کُفّارِ مکّہ نے تو اسے پارہ پارہ کر دیا' اس کی وحدت کو بھی ختم کر دیا۔ پھر کسی نے کہا کہ ہم یہودی ہیں' ہم حق پر ہیں۔ کسی نے کہا: ہم نصرانی ہیں' ہم حق پر ہیں۔ یہ حق بھی بانٹ دیا گیا' توحید بھی بٹ گئی: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ ''ہر کسی کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے۔'' ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸) ''تو (اے مسلمانو!) تم نیکیوں میں سبقت کرو۔'' یہ جو تفرقے اور تفریق کی باتیں ہیں ان سے باز آ جاؤ اور خیرات و حسنات میں دوسروں سے بازی لے جاؤ۔ اس ذمہ داری کو سمجھو اور پہچانو۔

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ''اُسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے'' — اُسی نے تمہیں مسلمان کا نام دیا تھا۔ یہ نام اللہ کا دیا ہوا بھی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی۔ حضرت ابراہیم نے دعا کی تھی:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠﴾

(البقرۃ:۱۲۸)

''اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنا مطیع فرمان بنائے رکھ اور ہماری نسل سے ایک اُمّت اٹھائیو جو تیری فرماں بردار ہو۔''

اے مسلمانو! تم دعائے ابراہیمی کی قبولیت کے مظہر ہو اور یہ جو خاص اعزاز تمہیں حاصل ہو رہا ہے اس پر بھی تمہیں فخر کرنا چاہیے کہ اللہ نے تمہیں اتنا بڑا منصب دیا۔ اور یہ منصب تمہیں کس لیے دیا گیا ہے! یہ منصب کوئی خاص پوزیشن نہیں ہے کہ تم اس پر صرف فخر کرتے رہو' بلکہ یہ ذمہ داری سے وابستہ منصب ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا

﴿عَلَيۡكُمۡ﴾ ''تاکہ رسول تم پر گواہ بن جائیں''۔حق کی گواہی شہادتِ حق' حق کا پیغام رسول تمہیں دیں ﴿وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''اور تم تمام انسانوں پر گواہ بن جاؤ''۔ اس لیے کہ اب آخری نبی اور آخری رسول حضرت محمد ﷺ آ چکے ہیں۔اس کے بعد کارِ نبوت و رسالت کی تبلیغی ذمہ داری اُمّت کے کاندھوں پر ہے۔

﴿فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''تو نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو''۔ پہلے رکوع اور سجود کا ذکر آیا تھا' اب اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہوا۔ اس لیے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ میں دین کی پوری عمارت آ جاتی ہے۔اللہ کے حقوق کو اقامتِ صلوٰۃ سے تعبیر کر دیا گیا جبکہ ایتائے زکوٰۃ لوگوں کے حقوق ہیں۔ چنانچہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ مل کر گویا دین کے ایک جامع تصوّر کو واضح کر رہے ہیں۔اور یہ حکم شہادت علی الناس کی ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہے' اس لیے کہ اسی سورت میں ''تمکّن فی الارض'' کے منصب پر سرفراز کیے گئے اہلِ ایمان کے جماعتی وصف کے بیان میں یہ آیت بھی آئی ہے:

﴿اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۱﴾﴾ (الحج)

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکن عطا کر دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔اور تمام امور کا انجام تو اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔''

یہ گویا شہادت علی الناس کا تقاضا ہے جو اُمّت کو ادا کرنا ہے۔یعنی دین کے پورے ڈھانچے' پوری عمارت کو قائم رکھنا۔اس کے لیے بطور تعبیر دو الفاظ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ذکر کیے گئے۔

شہادت علی الناس' شہادتِ حق بہت مشکل ذمہ داری ہے' لیکن اسے آسان کرنے کا نسخہ بھی بتا دیا گیا کہ: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ ؕ﴾ ''اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ'' اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ کا مطلب ہے: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ یعنی اللہ کی رسّی سے چمٹ جاؤ اور اللہ کی رسّی سے مراد قرآن حکیم ہے۔گویا حکم دیا جا رہا ہے کہ قرآن کو اپنا مقتدا اور پیشوا بنا لو۔اس کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ گے' اسے مضبوطی سے تھام لو گے تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

﴿هُوَ مَوۡلٰٮكُمۡ ۚ﴾ ''وہی تمہارا مولا ہے۔'' ملجا و ماویٰ وہی ہے۔اگر وہ تمہارا ہاتھ تھام لے تو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

﴿فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ ﴿۷۸﴾﴾ (الحج) ''تو کیا ہی خوب ہے وہ مولیٰ اور کیا ہی خوب ہے وہ مددگار۔'' اس سے بہتر ولایت کسی کی نہیں' اس سے بہتر مدد کسی کی نہیں۔جس کی دستگیری اللہ تعالیٰ فرمائے' اسے پھر کس کی پریشانی ہے!

یہ چند آیات مَیں نے آپ کے سامنے رکھی ہیں۔یہ اصل میں منصبِ امامت کے تقاضے اور اس کی فضیلت کے پہلو کو واضح کرتی ہیں۔یہ وہ شے ہے جو بطور اُمّتِ مُسلمہ اللہ تعالیٰ ہم سے چاہتا ہے' ہم سے مطالبہ ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس منصب کی اہمیت کو سمجھنے اور پھر اس کے تقاضوں کو صحیح معنوں میں پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین یا ربّ العالمین!

و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ○○

بقیہ: عرضِ احوال

تب اللہ نے ان کو فتح عطا فرمائی ہے' اسی طرح معاشی جنگ میں بھی اللہ ان کو سرخرو کرے گا۔ ان شاء اللہ! جس قوم نے چالیس سال مسلسل جنگ میں گزارے ہوں وہ اُن جنگی حالات میں اگر زندہ رہ سکتی ہے تو وہ معاشی ناکہ بندی میں بھی زندہ رہ لے گی۔اللہ ان کے لیے ذرائع پیدا کر دے گا۔اللہ تعالیٰ نے انسان کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا رزق پیدا کر دیا ہے۔انہیں اللہ تعالیٰ نے ان بدترین جنگی حالات میں رزق دیا ہے تو امن میں بھی دے گا۔وہ ان کا مسئلہ نہیں۔ان کا اصل مسئلہ طاغوتی تہذیب کے وہ بیج ہیں جو افغانستان میں بو دیے گئے ہیں۔یہ بیج طاغوتی طاقتوں کی اصل اُمید ہیں۔افغان طالبان کے لیے اصل چیلنج اس نسل کے اذہان میں دوبارہ دین کا بیج بونا ہے جو مغربی تربیت کے زیر اثر سرمایہ دارانہ نظام میں پناہ چاہتی ہے۔ان کو دوبارہ اللہ کے دین کی طرف لانا مسئلے کا اصل حل ہے۔یہی اللہ کے دین کی مدد ہوگی اور اسی کے نتیجہ میں افغان طالبان کے لیے بھی اللہ کی مدد آئے گی اور افغان طالبان اس معاشی جنگ میں بھی سرخرو ہو جائیں۔ان شاء اللہ العزیز!

قرآن کا تصوّرِ علم اور اس کی اہمیت

از قلم: ڈاکٹر ابصار احمد

اسلام وہ عظیم الشان نظامِ حیات ہے جس نے علم کی قدر و قیمت کو تسلیم کیا اور اسے بے حد اہمیت بخشی۔ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے وحی کی پہلی آیت ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱﴾ (العلق) پڑھنے کے حکم سے علم و دانش اور تعلیم و تعلّم کے ضمن میں انسان کی اس استعداد پر دلالت کرتی ہے جس سے اشرف المخلوقات کو خالقِ کائنات نے بطورِ خاص بہرہ ور کیا ہے۔ چونکہ فہم و ادراک اور علم و دانائی کا حصول انسانی زندگی کے اغراض و مقاصد میں سب سے بنیادی ہے اسی لیے حق تعالیٰ نے اسے مشاہدہ اور استنباط کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ قرآن حکیم نے جہاں آدم کے مسجودِ ملائکہ ہونے کا ذکر کیا وہاں اس کی وجہ یہ بتائی: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۳۱) ''اور اُس نے آدم کو سب نام سکھا دیے۔'' قرآن حکیم کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک علم' انسانیت کا شرف' قیادت کا سبب اور تسخیر ارض و سماء کا ذریعہ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی علم کے متعلق فرمایا: ((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ)) (رواہ ابنِ ماجہ) ''طلبِ علم ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔'' ایک اور ارشاد میں صاحبانِ علم کو ''ورثۃ الانبیاء'' قرار دیا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ عرب جہاں علامہ بلاذری کی تحقیق کے مطابق صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے' اسلام کی آمد کے بعد علم و حکمت کا سرچشمہ بن گیا جس نے پوری دنیا کو علوم و فنون سے سیراب کیا۔

قرآن کریم نے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات تمہارے لیے مسخر کر دی ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ﴾ (الحج:۶۵) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ زمین میں ہے' وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔'' دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ﴾ (لقمٰن:۲۰) ''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے

زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں۔'' ان آیات کے علاوہ بہت سی دوسری آیات میں بار بار تدبّر اور تفکّر پر زور دیا گیا ہے۔ تقریباً ۷۵۶ آیات میں اس مضمون کی تاکید کی گئی ہے اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ کائنات کا بغور مطالعہ کرے۔ بعض مقامات پر ہواؤں کے چلنے' بادلوں کے برسنے' پرندوں کے اڑنے' دانے کی بارآوری' دن اور رات کے الٹ پھیر اور دوسرے فطری امور کے مشاہدے کی ترغیب دی گئی ہے اور ذکر و فکر کی صلاحیت کو اولوالالباب (عقل والوں) کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے ان کو چوپایوں سے تشبیہ دی گئی' بلکہ ان سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے۔ ﴿بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾۔ چونکہ سائنسی تحقیقات طبیعی قوانین کے علم اور کائنات کے مشاہدے پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے غور و فکر اور مشاہدے کی تاکید کر کے گویا اسلام نے سائنسی تحقیقات کی راہ ہموار کر دی۔

علم اور حق (Knowledge and Truth)

اسلام دینِ فطرت ہے۔ یعنی اس کی تمام تعلیمات حقائق اور امورِ واقعہ پر مبنی ہیں نہ کہ اوہام و خرافات اور دور از کار قیاسات پر۔ اور ساتھ ہی وہ ایک ایسا جامع اور عالمگیر نظامِ زندگی ہے جس کا تعلق ایک طرف ذاتِ باری تعالیٰ اور عالم مابعد الطبیعیات سے ہے اور دوسری جانب کائنات اور عالمِ ارضی و سماوی سے ہے۔ اور چونکہ انسان کا کوئی فکر' کوئی نظریہ و عقیدہ اور کوئی عمل اور فعل علم کے بغیر استوار اور درست نہیں ہو سکتا اس بنا پر اسلام میں اہمیت کے اعتبار سے علم کو سرفہرست رکھا گیا ہے اور بار بار مختلف اسالیب بیان کے ذریعے اس کی افادیت اور ضرورت کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر F. Rosenthal نے اپنی کتاب "Knowledge Triumphant" میں بالکل صحیح لکھا ہے:

> ''علم ایک ایسا تصور ہے جو اسلام پر ہمیشہ چھایا رہا ہے اور اس نے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو ایک خاص شکل و صورت دی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم کے تصوّر نے مسلمانوں کی تہذیب کو ہمہ جہتی طور پر وسعت و قوت سے متاثر کیا ہے۔''

واقعہ یہ ہے' جیسا کہ پروفیسر مذکور نے اپنی کتاب کے پانچویں باب (صفحہ ۷۰) کا عنوان ''علم ہی اسلام ہے'' مقرر کیا ہے' قرآن حکیم میں اسلام اور دین کے لیے متعدد مواقع پر ''حق''

(یعنی سچائی یا Truth) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر علم بمعنی حق وسچائی مستعمل ہوا ہے۔ اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ازروئے قرآن علم اور اسلام دونوں ایک ہی جڑ کی دو شاخیں ہیں اور دونوں میں بہت قریبی نسبت ہے۔

اسلام میں علم کی اہمیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ میں تخلیق آدم کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے‘ اس میں صاف مذکور ہے کہ جب فرشتوں نے آدمؑ کے بالمقابل خلافتِ الٰہی کے لیے اپنے استحقاق اور تسبیح و تقدیس خداوندی میں ہمیشہ مشغول رہنے کے باعث آدم پر اپنی فضیلت و برتری کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم کائناتِ عالَم کے حقائق اشیاء بیان کرو۔ فرشتوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہی سوال آدمؑ سے کیا اور آدمؑ نے تمام حقائق اشیاء بیان کر دیے۔ اب فرشتوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور بارگاہِ الٰہی میں معذرت خواہ ہوئے۔ اس قصّہ سے صاف معلوم ہوا کہ آدم یعنی انسانوں کو فرشتوں پر جو تفوق و برتری حاصل ہے اس کی اساس و بنیاد بجز علم اشیاء کے کچھ اور نہیں ہے۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ ان آیات سے جہاں یہ ثابت ہوا کہ انسان (بحیثیت مجموعی) فرشتوں سے افضل ہے‘ ساتھ ہی یہ ثابت ہوگیا کہ علم کو عبادت پر فضیلت و برتری حاصل ہے۔ اس کی تائید اس ارشادِ نبویؐ سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق عالم کو عابد پر وہی فضیلت ہے جو بدر کامل کو ستاروں پر ہے۔ علماء پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں یعنی جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو روپیہ پیسہ بطور ترکہ نہیں چھوڑتے‘ بلکہ ان کا ترکہ علم ہوتا ہے اور علماء ہی اس کے وارث ہوتے ہیں۔ اسلامی نظریہ حیات میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے کتاب الایمان کے فوراً بعد کتاب العلم کو رکھا ہے۔

علم سے جو عظیم ترین معنوی اور روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں مندرجہ ذیل آیات میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا:

(۱) ﴿اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ﴾ (فاطر:۲۸)

’’اللہ کے بندوں میں سے درحقیقت علماء ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔‘‘

یہاں یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ عربی میں خوف کے معنی بھی ڈر ہیں‘ لیکن اس کے لیے علم

ضروری نہیں۔ اس کے برخلاف خشیہ اس ڈر کو کہتے ہیں جس کا محرک علم ہو۔ یعنی چونکہ علماء اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور آثارِ قدرت یعنی کائنات عالم کا علم رکھتے ہیں اس بنا پر فی الحقیقت صرف وہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔

(۲) ﴿وَمَا یَعۡقِلُہَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾ (العنکبوت)

’’اور اللہ کی ان نشانیوں کو اربابِ علم کے سوا کوئی اور نہیں سمجھتا۔‘‘

(۳) ﴿وَقَالُوۡا لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ﴿۱۰﴾﴾ (الملک)

’’اور وہ (یعنی اہلِ دوزخ) کہیں گے اگر ہم ہوش وگوش (یعنی علم) رکھتے تو دوزخ میں نہ جاتے۔‘‘

رہے دنیوی زندگی کے فوائد ومنافع‘ تو اس سلسلہ میں طالوت کی بادشاہی کے واقعے سے راہنمائی ملتی ہے جس کا ذکر سورۃ البقرۃ‘ رکوع ۳۲ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکومت وسلطنت کے لیے طالوت کو اس لیے منتخب فرمایا کہ حکمرانی کا استحقاق دولت مندی پر موقوف نہیں بلکہ اس کا انحصار علم اور جسم میں فراخی پر ہے۔ اور طالوت کو ان دونوں سے حصّہ وافر ملا تھا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَزَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ﴾ (آیت ۲۴۷)

علم کے ان عظیم دینی ودنیوی اور ظاہری وباطنی منافع وفوائد کے باعث قرآن میں اس کو خیر کثیر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۶۹)

’’اور جس شخص کو حکمت دے دی گئی‘ اس کو بلاشبہ خیر کثیر سے نواز دیا گیا۔‘‘

اگرچہ لغوی اور اصطلاحی طور پر علم اور حکمت میں کسی قدر فرق ہوسکتا ہے‘ لیکن اسلام میں دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔

علم کی اہمیت اور اس کی عظمت و شرف کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ آنحضرت ﷺ کو علومِ اوّلین وآخرین عطا کیے گئے تھے‘ لیکن چونکہ علم کی کوئی حد نہیں ہے اس لیے آپؐ کو حکم دیا گیا کہ یہ دعا کیا کریں: ﴿رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ (طٰہٰ)

علم‘ سماجی حقیقت اور اقدار (Knowledge, Social Realityand Values)

آج کل کے مروّجہ نظام علم وتعلیم میں بالعموم علمیات یا نظریۂ علم (Epistemology) اور نظریہ یا فلسفۂ قدر میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں فلسفے کے شعبوں میں

نظریۂ علم اور فلسفہ قدر یا اخلاق کو علیحدہ علیحدہ پڑھایا جاتا ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ علم اور قدر (Knowledge/Value) کی دوئی کو تعلیم کے نظام میں مستقل حیثیت دے دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ تقسیم عقلی طور پر محال ہے اور اسلام اسے تسلیم نہیں کرتا۔ نظریۂ علم یا علمیات کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ احوال وظروف کس قسم کے ہوتے ہیں جن میں علم کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ آج کے مادہ پرستانہ دور میں علم کی تعریف غلط طور پر صرف ان سوالات تک محدود کر دی گئی ہے جن کا تعلق صرف مادی دنیا اور اس کے واقعات (Facts) سے ہے۔ حالانکہ اگر علم کے موضوع میں خود اپنی ہستی کے بارے میں، حقیقت الحقائق یا بنائی حقیقت کے بارے میں اور سماج اور فرد کے اس سے تعلق کے سوالات شامل کیے جائیں تو اسلام کا یہ نقطہ نظر بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرازم اور سائنٹسٹ ازم بنیادی طور پر ایسے گمراہ کن (Mystifing) نظریہ حیات ہیں جن میں لوگوں کو اپنی ہستی اور زندگی کے مقاصد اور اعلیٰ حقائق کے وقوف سے محروم رکھا جاتا ہے۔ علم کے مسئلہ پر صحیح طور پر مابعد الطبیعیاتی حقائق اور سماجی تعلقات کے پس منظر ہی میں بحث ہوسکتی ہے اور صرف اسی صورت میں گمراہ کن نظریات اور التباسِ علمی کو حقیقی علم سے بدلا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں علم کا مسئلہ سطحی اور خارجی مباحث سے ہٹ کر انسانی ذہن وعقل کی ساخت اور سماج وتمدن کے اس طرز سے بحث کرتا ہے جو علم کو ممکن اور قابلِ حصول بناتے ہیں۔ علم وآگہی کس طرح ذہن انسانی سے علاقہ کرتا ہے اور یہ کہ فرد اور اس کے علم میں کیا رشتہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس طرح تعلیم کے مستحسن اور حریت پسند طریقے (Non-oppressive forms of Knowledge) بھی زیر بحث آتے ہیں جن کے ذریعے لوگ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور مثبت افکار کا اظہار برملا کرتے ہیں اور اپنا اور سوسائٹی کا گہرا شعور حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس موجودہ سیکولر غیر مذہبی نظام ہائے زندگی میں افراد کو ایسا کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دی جاتی۔ انہیں اپنے نظامِ زندگی کے بنیادی مسلمات کو چیلنج کیے بغیر اپنانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ایک بڑی اکثریت ان مسلمات کے فہم وادراک سے بھی عاری رہتی ہے۔

سطورِ بالا سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ رائج الوقت سیکولر نظامِ تعلیم اور فلسفہ علم، عقل و دانش کو تحدید اور انشقاق (Fragmentation) کے ذریعے بے اثر بنا دیتا ہے۔ ہم مسلمان

مفکّرین کا اہم فریضہ یہ ہے کہ ہم موجودہ اصطلاحاتِ علمی اور مباحث کو اپناتے ہوئے کسی بھی فکری استبداد کے ایجنٹ نہ بنیں، بلکہ ناقدانہ اور معروضی منہاج کو استعمال کرتے ہوئے سیکولر نقطہ نظر کی فکر پر بالادستی کو قبول نہ کریں اور ایک ایسے حقیقی اور مؤثر مذہبی کلچر کی تعمیر میں فعال حصہ ادا کریں جس میں زندگی کے تمام حقائق کا بطریق احسن اور منضبط طور پر خیال رکھا گیا ہو۔

عصری فلسفہ وتفکّر میں جس خصوصیت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، میرے خیال میں وہی اس کا سب سے بڑا نقص ہے۔ جدید فلسفے میں مسائل کے نظری پہلوؤں پر اس انداز میں گفتگو ہوتی ہے گویا سوچنے والا ان مسائل سے علیحدہ اور باہر وجود (Scholarly Detachment) رکھتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفہ وتفکّر میں ٹھوس اور حقیقی مواد باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے بیشتر مفکّرین کا اپنے ماحول اور سماجی حقیقت سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ ان کے خیالات زیادہ تر بالکل نظری اور صوری تحلیل کے عامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ٹھوس حقائق کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے معاشرے کی تعمیر میں وہ کوئی حصہ ادا نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس مسلمان مفکرین کو دور از کار، بے سود اور لایعنی مسائل میں الجھنے کی بجائے اپنی ذات کے شعور اور مثبت سماجی تبدیلی کے حصول میں کوشاں ہونا چاہیے۔ اور بنی نوعِ انسان کو انسان دشمن اور استحصالی فلسفیانہ افکار سے نجات دلا کر مذہب کے وسیع اور انسانیت پرور تصوّر کی روشنی میں علم وتحقیق کی تعمیر نو کرنی چاہیے۔ ان خیالات کو زیادہ آسان فہم انداز میں بزبان انگریزی یوں ادا کیا جا سکتا ہے:

> *We Muslims should stand for less academics and more self-understanding and concrete social change. We should liberate humanity from inhuman and enslaving philosophical presuppositions and reconstrut knowledge in the light of broad religio-humanistic framework of Islam.*

تاریخی طور پر بنی نوعِ انسان کے موجودہ علمی وتمدنی انتشار اور بگاڑ کا آغاز یورپ کی اٹھارہویں صدی کی تحریکِ عقلیت پسندی یا روشن خیالی سے شروع ہوتا ہے، جس میں عقل (ایک محدود تصوّر کے ساتھ) اور تحلیل، علمی منہاج کے دو اہم ستون قرار پائے۔ اس تحریک کے فلاسفہ اور مفکّرین نے مختلف علوم اور سائنس پر تحقیق ہی نہیں کی، بلکہ ان سے زندگی کے بارے میں جامع

نقطہ نظر بھی اخذ کرنا چاہا۔ سائنسی علوم سے انہوں نے تشکیک اور تدریجی استنتاج کا انداز اختیار کیا' جس کا سب سے بڑا علمبردار فرانسیسی مفکر ڈیکارٹ ہے۔ مزید برآں تجسس و دریافت کے عمل سے مطابقت رکھتا ہوا اضافیت پسند طرزِ فکر (Relativistic attitude) مذہبی عقائد اور زندگی کی عظیم تاریخی اقدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس فلسفیانہ تشکیک اور اضافیت پسندی کو انسان کی عظمت بڑھانے میں ممد سمجھا گیا۔ حالانکہ بعد کے ڈیڑھ دو سو سال کے واقعات نے مغربی مفکرین کے اس خیال کو خوش فہمی سے زیادہ کچھ ثابت نہ کیا۔ بیکن' ڈیکارٹ' ہابس' لاک' نیوٹن ـــــ ان تمام مفکّرین نے حقیقت (Truth) کو جاننے کے عقلی (Rational) معیار پر بالکلیہ زور دیا۔ نیوٹن کے میکانیاتی منہاج کو اس پورے طریق علم میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ انیسویں صدی میں 'عقلیت پسندی' مادیت اور مادی نقطہ نظر کے ایک بڑے خطہ ارضی پر غلبے کے ساتھ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اثباتیت' مارکسی مادیت اور بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والی ایک تحریک منطقی تجربیت نے اقدار (values) کو علم کے دائرے سے یکسر خارج کر دیا۔ اخلاقی اقدار کے مباحث کے بارے میں کہا گیا کہ یہ علم یا proper knowledge کا حصہ نہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افادیت پسندی (Utilitarianism) کے مکتب فکر نے اپنے قدم جما لیے۔ جس میں اگرچہ نظری طور پر خوشی یا مسرت کی بات کی گئی لیکن عملاً خوشی کا تعین زیادہ سے زیادہ مادی اشیاء کی فراہمی اور جسمانی سہولت کے حصول سے کیا گیا۔ موجودہ دور کی صنعتی تہذیب میں اس رویّے کی عملداری ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے دوران میں نے خود یہ احساس شدّت سے محسوس کیا ہے کہ کم از کم اینگلو امریکن لسانی اور تحلیلی فلسفہ انسان تمدن' اخلاق اور علمی مسائل حل کرنے میں بالکل قاصر ہے اور وہاں کے نوجوان طلبہ کی ایک بڑی تعداد جدید فلسفے سے بیزار نظر آتی ہے۔ ان کے ساتھ گفتگوؤں کے بعد جو خیال شدت سے ذہن میں ابھرتا تھا اس کو بزبان انگریزی یوں ادا کیا جاتا ہے:

Contemporary Anglo-American Iinguistic and analytic philosophy is at a dead end. Its acadamic practitionars have abandoned the attempt to understand the world, let

alone change it. They have turned philosophy into a narrow and specialized acadamic subject of little relevance and interest of anyone outside the small circle of professional philosophers. The result has been that serious philosophical work beyond the conventional sphere has been minimal.

بزک سکولیموسکی نے اپنے مضمون میں جو انگریزی مجلّے 'ECOLOGY' کے جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوا' موجودہ دور کے علمی اور تعلیمی رجحان کو "BAZAROVISM" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لفظ اس نے ٹرگینیو کے ناول 'Fathers and Children' سے اخذ کیا ہے جس کا مرکزی کردار Sergei Bazarov عصر حاضر کے ملحد' مادی اور سائنسی نقطہ نظر رکھنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک Fact اور Positive knowledge کے علاوہ کسی اور چیز کی کوئی حقیقت نہیں۔

He has no use for art, for poetry, for other romantic rubbish. The modern man is engulfed so completely by the worship of reason and scientific fact and bogus empericism that it is often difficult to see through them and assess their impact on society. According to Skolimowski, Bazarov is at once an embodiment of the prevailing nehilism, materialism, scientism and positivism, which in their respective ways regarded intrinsic values as secondary, insignificant, or even non-existent in the world of cold fact, clinical objectivity and scientific reason.

اس کے برعکس اسلامی نقطہ نظر سے علم صرف مادی اور واقعاتی یا سائنسی معلومات کے ذخیرے کا نام نہیں' بلکہ انسان کے اس مابعد الطبیعیاتی کلی نظریے کا حصّہ ہے جس میں وہ نہ صرف سائنسی معلومات اکٹھی کرتا ہے بلکہ خود اپنی حقیقت' ماہیتِ کائنات' خالقِ کائنات اور مبدأ و معاد جیسے تمام اہم سوالات سے بحث کرتا ہے۔ مشہور فلسفی لڈوِگ وٹگنسٹائن نے اسی خیال کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

Even if every possible scientific question were answered, the problem of our living would still not been touched at all."

چنانچہ قرآن کا نظریہ علم حیاتِ انسانی کے ایک مکمل تصوّر (Total Gestalt) کا ایک جزو ہے۔ اس میں علم اور عمل دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک مشہور مقولہ ہے: العمل بلا علم ضلال والعلم بلا عمل وبال ''جو عمل علم کے بغیر ہو وہ گمراہی ہے اور جو علم عمل کے بغیر ہو وہ وبال اور مصیبت ہے۔'' جو لوگ اپنے علم پر عمل نہیں کرتے' قرآن و حدیث میں ان کی شدید مذمت آئی ہے۔ ایک آیت میں عالم بے عمل کو اس گدھے سے تشبیہہ دی گئی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔ اس بنا پر قرآن کی اصطلاح میں وہ عالم بھی جاہل ہے جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ ازروئے قرآن علم صرف تصوراتی سطح پر صحیح معنوں میں علم نہیں ہوتا ہے۔ یہ علم اس وقت بنتا ہے جب یہ طالب حق کے وجود میں سرایت کر جائے اور اس کا عمل اس کے مطابق ہو جائے۔

Knowledge in the framework of Islam can not be squared with an anti-activist or 'spactater' view of it which aims merely at an enlargement of the understanding. Indeed it here becomes an essentially practical subject, it seeks to get people to do things. It cannot remain uncommitted to social action.

علم کے ذرائع

آخر میں ایک اہم سوال پر جو حصولِ علم کے ذرائع سے متعلق ہے' مختصراً روشنی ڈالوں گا۔ علم حاصل کرنے کے منابع و ذرائع کیا ہیں؟ قرآن مجید نے اس سوال کا جواب بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اسے متعدد مواقع پر مختلف اسالیب سے واضح کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں قرآن علم کی دو قسمیں بیان کرتا ہے:

(۱) علم حضوری: جو بلا کسی واسطہ اور ذریعہ کے براہِ راست حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً انسان کو خود اپنی ذات اور اس کی کیفیات و محسوسات کا علم۔ اس کو وجدان' الہام یا فطرت بھی کہتے ہیں۔ اس کی ابتدائی شکل حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن میں آتا ہے: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۲۱﴾ (الذّٰریٰت) ''اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی (نشانیاں ہیں)۔ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟'' یہ فرما کر اسی ذریعہ علم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس)

(۲) علم حصولی: یہ اس علم کا نام ہے جو کسی شے کے واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس علم کے حصول کے تین ذرائع ہیں: (i) وحی الٰہی (ii) عقل (iii) حواسِ خمسہ۔

قرآن میں جابجا انسانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ان قوتوں کو بروئے کار لائیں جو علم کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ ان قوتوں سے کام نہیں لیتے' یہاں تک کہ وہ زنگ آلود ہو جاتی ہیں' ان کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ سورۃ الاعراف' آیت ۲۳ میں فرمایا: ''ان کے پاس دل ہیں مگر یہ ان سے سمجھ کا کام نہیں لیتے۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے یہ نہیں دیکھتے' ان کے پاس کان ہیں مگر یہ ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے' اور یہی لوگ تو غافل ہیں۔''

اس آیت میں قلب کو آلۂ تفقہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک نہیں' قرآن مجید میں اس جیسی اور متعدد آیات ہیں جن میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید سنائی گئی ہے اور ان کا ٹھکانہ دوزخ بتایا گیا ہے جو فہم و ادراک اور تعقّل و تفکّر کی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے اور اسی لیے جاہل بنے رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت کے حصے ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا﴾ میں قلب کو آلہ تفقہ قرار دیا گیا ہے۔ تفقہ صرف منطقی discursive فکر کا نام نہیں جس میں اشیاء پر علیحدہ علیحدہ اور صرف ظاہر اشیاء پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ تفقہ وہ گہرا اور تالیفی فکر ہے جس میں حقیقت کا من حیث المجموع وقوف حاصل کیا جاتا ہے اور انائے صغیر کا انائے کبیر کے ساتھ براہِ راست تعلق پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حقیقت کے کُلّی ادراک کے لیے مشاہداتِ حواس کو فؤاد یا قلب کے اس وظیفہ سے بھی مدد لینی ہوگی جسے قرآن نے تفقہ کہا ہے۔ میرے خیال میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے اسی کو عشق کہا ہے۔ بالکل اسی خیال کا اظہار امریکی عیسائی مفکّر پال ٹلک نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"Full knowledge does not admit a difference between itself and love, or between theory and practice." (The Shaking of the Foundation, p.115.)

حقیقت یہ ہے کہ عقلِ انسانی کی نوعیت و ماہیت سے آج کا جدید ذہن بالکل ناواقف ہے۔ اس نے عقل کو صرف استنباط و استقراء کا آلہ یا Functional Intelligence سمجھ رکھا ہے' جبکہ دراصل عقل انسانی کے سوتے انسان کے انتہائی اندرونی روحانی مرکز سے پھوٹتے ہیں۔

اقبال: ایک تاریخ ساز شخصیت

راحیل گوہر *

انسانی فکر خلا میں پیدا نہیں ہوتی اور نہ ایسے آزاد ٹکڑوں میں بٹی ہوتی ہے جن کے تاریخی سیاق وسباق نہ ہوں۔ انسانی فکر ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے اور کوئی فکر ایسی اٹل اور غیر متبدّل نہیں ہوتی کہ اس میں ترمیم وتنسیخ یا تاریخی ارتقا ممکن نہ ہو۔

فکر یا فلسفہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ اپنے طور پر ان مسائل کا حل پیش کرتے ہیں جو کسی سماج میں مختلف عوامل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر فلسفہ ایک انفعالی صفت رکھتا ہے، اس لیے کہ وہ ان اسباب کا پیدا کردہ ہوتا ہے جو سماج میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض فلسفوں یا افکار کا ایک فاعلی کردار ہوتا ہے کہ وہ آنے والی فکر، سماجی ڈھانچوں اور سائنسی ومعاشرتی علوم کی ترتیب وتشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح فکر وفلسفہ انسان کی زندگی سے ایک گہرا رشتہ رکھتے ہیں، اس کے باوجود کہ بعض فلسفیانہ افکار بظاہر زندگی کے مسائل سے لاتعلق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لاتعلقی محض کم نظری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

علّامہ اقبال کو جو آفاقی درجہ حاصل ہوا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما رہے ہیں۔ ان میں سرفہرست وہ لوگ ہیں جو اپنے خیالات و افکار سے پوری دنیا کو متاثر کر چکے تھے۔ پھر یہ کہ اقبال صرف اسلامی فکر وفلسفہ ہی سے متاثر نہ تھے بلکہ مغربی فکر پر بھی انہوں نے غور وفکر کیا اور کہیں بھی موجود حکمت کو اپنی گمشدہ متاع تصوّر کر کے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ: ''فلسفے میں قطعیت نام کی کوئی چیز نہیں۔'' چنانچہ انہوں نے ہر چشمے سے اپنے دل ودماغ کو سیراب کیا۔ اگر ہم اقبال کی نظم ونثر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ فلسفہ وفکر کے اعلیٰ درجے پر تھے۔ انہوں نے بہت

*Email:raheelgoher5@gmail.com

سے مقامات پر شرق وغرب کے مفکّرین سے نہ صرف اختلاف کیا ہے بلکہ ان کے نظریات کو ردّ بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں اقبال پر بہت سے اعتراضات بھی کیے گئے۔

اقبال کا کلام ہمارے شعور واحساس، قلب ووجدان اور اعصاب میں حرکت وحرارت، سوز وگداز، درد وتپش پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں، فاسد اور باطل اقدار جل کر فنا ہو جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں معنوی بندش کے ساتھ ساتھ لفظوں کی ترکیب، ہم آہنگی، اتار چڑھاؤ، روانی، تسلسل اور موسیقیت اس قدر زیادہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کو پروان چڑھایا، ان کی شاعری کو نت نئے افکار کی جولانی اور قوتِ تاثیر عطا کی، اس میں درس وتدریس اور مطالعہ کے شوق وانہماک کے ساتھ ان کی ''آہِ سحر گاہی'' کا بھی بڑا حصہ ہے۔ جب سارا عالَم خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہتا، اس اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے ربّ کے سامنے سجدہ ریز ہونا، گڑگڑانا اور رونا ہی وہ چیز تھی جو ان کی روح کو ایک نئی نشاط اور ان کے قلب کو ایک نئی روشنی عطا کرتی۔ اقبال کو یہ نعمتِ عظمیٰ عین عالَمِ شباب ہی میں حاصل ہو گئی تھی ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی!

اقبال کے نزدیک یہ زندگی کا ایک بہت ہی عزیز سرمایہ ہے، بڑے سے بڑے عالم، حکیم اور مفکّر بھی اس سے مستغنی نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

اقبال کے ہاں فکری گہرائی بھی ہے اور فنی رعنائی بھی۔ آپ بالِ جبریل پڑھیں یا ضربِ کلیم، آپ کے مطالعہ میں بانگِ درا ہو یا ارمغانِ حجاز، آپ محسوس کریں گے کہ اقبال کی نگاہ دُوررس ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد اس منظر کا تماشائی بن جائے۔ ''بانگِ درا'' میں دل سے صدا نکلی:

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ مَیں نے، اوروں کو بھی دکھلا دے!

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر
خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے!

اقبال کو ان کے فکر و فلسفہ کی آفاقیت کے علاوہ جس چیز نے ایک عہد ساز شخصیت بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہ مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی حیثیت اجاگر کرنے کی کوشش ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے خیالات کو مجتمع کرنے اور انہیں ایک مربوط شکل دینے کا فریضہ انجام دیا۔ فرماتے ہیں: ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا

یہ شعر تاریخ ساز شخصیات کے لیے لکھا گیا۔ خود علّامہ اقبال بلاشبہ ایک ایسی عہد ساز شخصیت ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ریاست کا ''نظریہ'' متعارف کروایا۔ اپنی شاعری میں عالمی فکر کی اس قوت کو بیان کیا جس کے محور پر انسانیت زمانۂ اوّل سے گردش کرتی چلی آ رہی ہے۔

اقبال کے پیش نظر دو اہم مسائل تھے جنہوں نے ان کی روح کو بے چین کیا ہوا تھا۔ ایک یہ کہ پورا عالَمِ اسلام سامراج کے ہاتھوں پابہ زنجیر ہے۔ دوسرا یہ کہ عالمگیر اخوت و مساوات کے اسلامی تصوّرات ہی اُمّتِ مُسلمہ کو نکبت و ادبار کی اس کیفیت سے نکال سکتے ہیں۔ اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں عمومی طور پر انسانوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ انسان دوستی، احترامِ آدمیت اور عظمتِ انسان کی تائید و تفسیر کلامِ اقبال کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ کلامِ اقبال میں ایسے کئی اشعار ہیں جن کا موضوع انسان اور عالَمِ انسانیت ہے۔

اقبال کو مسلمانوں کے صرف جاہ و منزلت سے محروم ہو جانے کا قلق نہیں تھا، بلکہ ان کا حاصل مطالعہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے علم کی مسند بھی مغرب کے لیے خالی کر دی تھی۔ دوسری طرف مغرب نے ان کے علمی اثاثہ کے بل بوتے پر فلسفہ جدید اور سائنس کی شاندار عمارت تعمیر کر لی۔ اقبال نے اس حقیقت کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں روشن خیالی پیدا نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں! مزید یہ کہ نشأۃِ ثانیہ صرف ان تہذیبوں کا حصہ کیوں بنی جو یہودی اور عیسائی مسلکوں پر عمل پیرا تھیں!

اقبال کے نزدیک مسلمان معاشرہ میں زوال اور جمود کی تین وجوہات ہیں:

(ا): مسلمان تصوّف کے زیرِ اثر عمل کی قوت سے محروم ہو گئے ہیں۔ مصیبت و ابتلا کو قسمت کے کھاتے میں ڈال کر اس کے مداوا کی کوشش نہیں کرتے۔ لاشعوری طور پر وہ ایک ایسا مزاج رکھتے ہیں جو حرکی قوت سے محروم ہو چکا ہے۔

(ب): اپنے مذہب کی بنیاد انہوں نے ایسی منطق پر رکھ لی ہے جو ارسطو سے مستعار ہے۔ یہ حقیقت کو ایک زندہ اور فعال شے سمجھنے کی بجائے بے جان اور مجرد جوہر سمجھتی ہے۔ دراصل خدا کو محض ایک منطقی نتیجہ کے طور پر سمجھا نہیں جا سکتا بلکہ وہ ایک زندہ حقیقت کی حیثیت سے انسانی وجدان کے راست تجربے میں محسوس ہو سکتا ہے۔

(ج): مسلمانوں نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کہ ان کے مذہب کا ''طاقت'' کے ساتھ ایک لازمی رشتہ ہے۔ اسلام محکومی اور بے بضاعتی کی زندگی کو صحیح نہیں سمجھتا۔ عمومی طور پر ایک انسان اور بالخصوص مسلمان اس دنیا میں اپنے تخلیقی عزائم پورے کرنے آیا ہے۔ اس کی منزل معرفت اور روحانی سکون نہیں بلکہ اضطراب اور عمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب ایک روحانی تجربہ (احساس) ہے، لیکن یہ مقصود بالذّات نہیں، بلکہ عمل کے لیے ایک مہمیز ہے۔ صوفی اور پیغمبر میں یہی فرق ہے کہ صوفی مقامِ وصال میں فنا ہو جاتا ہے جبکہ پیغمبر اس سے نکل کر عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک بزرگ مولانا عبدالقدوس گنگوہی نے واقعۂ معراج کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''محمد عربی ﷺ بر فلک افلاک رفت و باز آمد، واللہ اگر من رفتمے ہرگز نیامدے'' (محمد عربی ﷺ آخری آسمان تک گئے اور واپس آ گئے، خدا کی قسم اگر مَیں اس معرفت کی بلندی پر گیا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا)۔ یہ محض اپنی ذات کے ترفع اور روحانی تسکین تک خود کو محدود رکھنا ہے، جبکہ پیغمبر کے دل میں اپنی پوری اُمّت کا درد سمایا ہوتا ہے۔ اسے پوری اُمّت کی فوز و فلاح اور ان کے لیے خوشنودیٔ ربّ کی پیاس ہوتی ہے۔ اس کی پوری زندگی اس مشن کی تکمیل میں گزر جاتی ہے، پھر بھی اس کی روح کو قرار نہیں آتا۔

اقبال کے عمل کا اصل محاذ مشرق جبکہ ان کا فکری افق پورا عالَم ہے۔ وہ دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کے لیے مشرق کی سرزمین کو موزوں ترین سمجھتے تھے اور اس کی تکمیل پوری انسانیت کی سطح پر کرنے کے متمنی تھے۔ وہ ہماری ملّی تاریخ کے ایک بلند پایہ شاعر، دانشور اور مفکّر تھے، جنہوں

نے شعوری طور پر آفاقیت کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔

علّامہ اقبال اسلامی قومیت کے علَم بردار تھے۔ ان کی اسلامی اور ملّی شاعری آفاقیت کے منافی نہیں۔ درحقیقت اقبال کی انسان دوستی کو قرآن کے تصوّرِ توحید سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ نظریۂ توحید ہی انسان کو خوف سے نجات دلاتا ہے اور مظلوم میں ظالم سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اقبال کی تعلیمات کیا ہیں؟ اثباتِ ذات، یقینِ محکم، عملِ پیہم، آزادی، مساوات، اخوت، صداقت، عدالت، محبّت، احترامِ انسانیت، تسخیرِ کائنات۔ یہ سب تعلیمات آفاقی اور اعلیٰ اقدار کی حامل ہیں۔

ہماری قومی تاریخ میں علّامہ اقبال کی حیثیت سنگ میل کی سی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد برصغیر میں اقبال ہی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے تہذیبی سطح پر ہمیں وہ شعور دیا جو قوموں کی زندگی، بقا اور تسلسل کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اقبال کے دور میں مسلمانانِ ہند اور پوری اُمّتِ مُسلمہ زوال کا شکار تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد غلامی اور محکومیت کا طوق مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا تھا۔ ظلم اور زیادتی کا ماحول چہار سُو پھیلا ہوا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اقبال نے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان کے مرض کی تشخیص کی۔ انہیں خود شناسی کا سبق سکھانے کے لیے ایک عظیم فکری جہاد کیا۔ اپنی حوصلہ مند شاعری سے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ انہیں احساس دلایا کہ غلامی کا یہ جُوا اُتار پھینکنے کے لیے انہیں سخت محنت کرنا پڑے گی اور اگر وہ خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو دنیا سے ان کا وجود تک مٹ جائے گا۔ ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال کے نزدیک اس کائنات کی تخلیق کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ قدرت کا ایک بامقصد اور ارادی فعل ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾

(آل عمران: ۱۹۱)

”(وہ اصحابِ عقل و دانش) جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں:) اے ہمارے پروردگار! تو نے اس (کائنات) کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا۔“

درحقیقت اس دُنیا میں کوئی چیز ہمیشہ ایک جیسی حالت میں نہیں رہتی۔ ہر چیز میں تغیّر و تبدّل ایک فطری عمل ہے۔ اسی طرح اس کائنات میں بھی تعمیر و تخریب کا عمل جاری رہتا ہے۔ ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!

درحقیقت ہر تعمیر، تخریب کی کوکھ ہی سے جنم لیتی ہے۔ تخریب کا منطقی انجام تعمیر ہی ہوتا ہے۔ تاتاری قوم انسانوں کے خون کی پیاسی تھی۔ جہاں جاتے، کشتوں کے پشتے لگا دیتے۔ ان کے جسم و جاں کی پیاس انسانی خون ہی سے بجھتی تھی۔ ملّت کو بیخ و بن سے اُکھاڑ دینے والا سب سے بڑا فتنہ یہی تھا جس کے متعلق اللہ نے یہ معجزہ دکھایا کہ مغلیہ سلطنت کی بنیاد کا سبب یہی خوں آشام قوم بنی۔ بقول اقبال ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

دنیا کی زندگی میں انسان کو جمادات و نباتات اور حیوان بن کر نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ بن کر رہنا ہے۔ جس طرح انسان اشرف المخلوقات ہے اسی طرح تمام انسانوں میں مسلمان اشرف ہے۔ شخصی انسانیت کی تکمیل پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہوئی ہے اور قومی انسانیت کی تکمیل مسلمان سے۔ مسلمان کی تکمیل انسانیت بھی سب سے پہلے اسی مادی دنیا اور فانی زندگی کے لیے ہے۔ قلب کی صفائی اور روح کی پاکیزگی سب سے پہلے اسی جسم و جاں اور گوشت پوست کے لیے درکار ہے۔ عبادت و ریاضت سب سے پہلے اسی معیشت و معاشرت کے لیے مفید ہے۔ اگر کوئی مسلمان عابد و زاہد ہے، متقی و پرہیزگار ہے، ذکر اذکار میں مشغول ہے، مجاہدہ و ریاضت کرتا ہے لیکن اپنے ماحول سے بے خبر ہے، بندوں کے حقوق ادا نہیں کرتا، اتباعِ سُنّت سے قاصر رہتا ہے، خدمتِ خلق سے غافل ہے تو وہ خلافتِ الٰہی کے منشا و مقصد کو پورا نہیں کرتا اور تکمیلِ انسانیت کے منصب کا اہل نہیں۔

کسی قوم میں سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب لانا ہو تو نظریں نوجوان نسل کی جانب ہی

اٹھتی ہیں۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک بھی نوجوان قوم کا سرمایۂ افتخار اور اس کے لیے ایک عظیم اثاثہ ہیں۔ قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں نوجوانوں کے جوش وولولے اور مضبوط کردار ہی کی مرہونِ منّت ہیں۔ اسی لیے علّامہ نے فرمایا: ؎

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اقبال کی نظر میں اسلامی قومیت کا وِژن دیگر اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصول نہ اشتراکِ زبان ہے' نہ اشتراکِ وطن اور نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی' بلکہ ہم سب اس برادری کا حصہ ہیں جو نبی محترم ﷺ نے تشکیل فرمائی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِؐ ہاشمی!

علّامہ اقبال ایک فرد نہیں' دبستان تھے۔ برکت' خیر وصداقت' روشنی وحلاوت اور حرارت کا زندۂ جاوید دبستان! تاریخ کے ایک خاص موڑ پر مسلم کلچر کی بساط پر اقبال جیسے نابغہ کا ظہور ایک عطیۂ الٰہی تھا۔ اقبال کے نزدیک اسلام نہ تو زمانۂ انحطاط کی خانقاہوں کے مراقبوں کا تختۂ مشق ہے' نہ واعظوں کا وسیلۂ رزق ہے اور نہ ژولیدہ مُو' آشفتہ مغز سیکولر دانشوروں کا مؤید' بلکہ ''قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہِ'' کی حرارت سے مملو ایک زندہ حقیقت الحقائق ہے۔ اس سے انسانی حیات کے ٹھنڈے چولھے گرم ہوتے ہیں اور دل رزم گاہِ حیات کا امین بنتا ہے۔ باعثِ ننگ ہے ایسے دانشوروں کا وجود جو قلب کے رہزن اور نظر کے ابلیس بن کر دھڑلّے سے دن دہاڑے ابن آدم کے سکون اور سکینت کے قافلے لوٹ لیتے ہیں' جبکہ لائق مبارک ہے رحمتِ ربانی سے الہام یافتہ اقبال جیسے اربابِ نظر کا وجود' جن کے افکار کے فیض سے انسانیت کو پورے قد سے بڑھنا اور کھڑا ہونا نصیب ہوتا ہے۔

اقبال کا سب سے پہلا مربّی ومرشد ان کا ایمان ویقین ہے۔ یہی ان کی طاقت وقوت اور حکمت وفراست کا منبع ہے۔ البتہ اقبال کا یقین خشک اور جامد ایمان کی طرح نہیں ہے بلکہ عقیدہ ومحبّت کا ایک حسین امتزاج ہے جو اُن کے قلب ووجدان' اُن کی عقل وفکر غرضیکہ اُن کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت

راسخ الایمان تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی محبّت اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندۂ جاوید دین ہے جس کے بغیر انسانیت فلاح و سعادت کے بامِ عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ؎

وہ دانائے سبل' ختم الرسل' مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

اس دورِ مادیت اور مغربی تہذیب وتمدن کی ظاہری چمک دمک سے اقبال کبھی متاثر نہ ہو سکے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اور: ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں مَیں
کہ مَیں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

اور: ؎

رہے ہیں' اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

علّامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام ''اسرارِ خودی'' میں ملّتِ اسلامیہ کی بنیادوں کے سلسلے میں نبی مکرم ﷺ کے ساتھ اپنے روحانی تعلق' دائمی وابستگی اور اپنی فداکارانہ محبّت کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ جب نبی کریم ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

''حضور اقدس ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور حضور ﷺ کے نام سے ہی ہماری عزت وآبرو ہے۔''

اور: ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمّتش

’’آپ ﷺ راحت و آرام کے لیے ایک خستہ حال بوریے پر احسان فرماتے ہیں
جبکہ کسریٰ کا تاج آپؐ کی اُمّت کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔‘‘

۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۰ء تک پورے ۲۲ برس اقبال نے اسلام کے نظامِ فکر‘ فلسفہ اور حکمت کو اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے بیان کیا۔ اسے قرآن کی ایک نہایت جدید اور عمدہ تفسیر کہا جا سکتا ہے‘ اگرچہ یہ ’’تفسیر اقبال‘‘ کے نام سے کہیں نہیں ملے گی۔ صاحب ’’تدبّر قرآن‘‘ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے فرصت کے چند ایام کے دوران علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا تھا۔ اس کے بعد مولانا نے اپنے تاثر کی شدّت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

’’قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علّامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہتر کر چکے ہیں۔‘‘

اقبال یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے پیغام میں سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں ہے۔ اقبال سرورِ کائنات ﷺ کے حضور مناجات کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: ؎

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

’’(اے اللہ کے رسول ﷺ!) اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو‘ اور اگر میری شاعری میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کی ترجمانی ہے تو آپ میرے فکر کا پردہ چاک کر دیجیے اور اس چمنستان کو مجھ جیسے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ مزید برآں قیامت کے دن مجھے ذلیل و خوار کیجیے گا اور مجھے اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجیے گا!‘‘

اقبال‘ قرآن کو ہی اُمّتِ مُسلمہ کی ترفّع اور بلندی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنی نظم ’’جوابِ شکوہ‘‘ میں لکھتے ہیں: ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

علّامہ اقبال نے مغربی فکر پر شدید تنقید اور مغربی تہذیب کی نفی کی۔ وہ تجدیدِ ملّت اور اسلامی احیائے فکر کے علم بردار بن کر سامنے آئے۔ سب جانتے ہیں کہ اُس دور میں سلطنتِ عثمانیہ کی دھجیاں بکھر گئی تھیں اور نو آبادیاتی استعمار پورے عالَمِ اسلام پر حکمراں تھا۔ ایسے حالات میں اقبال نے یہ خوشخبری دی کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو کر رہے گی۔ اس طرح اقبال اسلام کے روشن مستقبل کے مبشر بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے ایک اور بڑا کام یہ کیا کہ وطنی قومیت کا شدّت سے انکار کیا۔ اُس دور میں ہندومت کی تجدید کا عمل بڑے زور شور سے شروع ہو چکا تھا۔ بنکم چٹرجی ہندومت کے احیاء کا بہت بڑا عَلَم بردار تھا۔ اُس نے ’’بندے ماترم‘‘ کا ترانہ پیش کیا۔ اقبال نے اپنی نظم ’’وطنیت‘‘ میں اس کی شدید نفی کی ہے:

اِس دور میں مے اور ہے‘ جام اور ہے‘ جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے‘ وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے!
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے!
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دِکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ بطور قوم ہم نے اقبال کا تذکرہ ماند نہیں پڑنے دیا۔ ہمارا کم و بیش ہر بیانیہ اور ہر مکالمہ کسی نہ کسی حوالے سے اقبال سے ضرور متاثر اور متعلق ہوتا ہے۔ سال میں دو

مواقع ایسے ضرور آتے ہیں جب اقبال کا ذکر پورے زور شور سے کیا جاتا ہے‘ یعنی ۹ نومبر ان کے یومِ پیدائش اور ۲۱ اپریل یومِ وفات پر! تاہم اس کے ساتھ ہی یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہم اقبال کے ذکر کو ایک رسمی انداز سے آگے نہیں بڑھا سکے۔ فکرِ اقبال کی جو تفہیم کی جانی چاہیے تھی وہ عوام الناس کی سطح پر تو کیا ہوتی‘ علمی اور تحقیقی اداروں میں بھی کما حقہ نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا قومی و ملکی نظام اور اجتماعی اسلوبِ فکر و عمل‘ فکرِ اقبال سے کوسوں دور ہے۔

حکیم الامت علّامہ اقبال کی فکر اور رہنمائی قیامِ پاکستان کی اساس ہے‘ جس کا اعتراف بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی کیا تھا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ نسل نو کو ایک مربوط اور منظم انداز سے فکرِ اقبال سے روشناس کروانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ آج ہمیں طرح طرح کے چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ تقاضا اور بھی بڑھ گیا ہے کہ ہم اقبال کا تذکرہ محض رسمی حد تک محدود نہ رکھیں بلکہ فکرِ اقبال کو اپنے قومی نظامِ تعلیم و تربیت کا حصہ بنائیں۔ ان کے خیالات کی روشنی میں‘ جدید انکشافات و اکتسابات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے مشن کو آگے بڑھائیں۔ مسلمانوں کے موجودہ حالات سے چشم پوشی اختیار کرنا اقبال کی تعلیمات کی ناقدری ہے اور یہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں۔

ایک عظیم گناہ جو اس جدید تمدن کا پیدا کردہ ہے وہ ہے مادّہ پرستی۔ یہ درحقیقت جدید عصری تعلیم کا ثمرہ ہے‘ جس نے ہماری نسلوں کو تباہ رکھا ہے۔ آج حال یہ ہے کہ نوجوانوں کے قلوب ایمان کی حرارت اور یقین کے سوز سے خالی ہیں۔ یہ عالمِ نو ایک ایسی متحرک شے بن کر رہ گیا ہے کہ جس میں نہ کوئی زندگی ہے اور نہ کوئی روح‘ نہ شعور و وجدان ہے اور نہ مسرت و غم کا احساس!

اقبال کے تمام حکیمانہ افکار کا سرچشمہ صرف ایک تصوّر ہے جسے انہوں نے ’’خودی‘‘ کا نام دیا ہے۔ ان کے تمام تصوّرات اس سے علمی اور عقلی طور پر وابستہ ہیں۔ اقبال کا فکر ایک ایسے نظامِ حکمت کی صورت میں ہے جس کا ہر تصوّر دوسرے تمام تصوّرات سے علمی اور عقلی تائید حاصل کرتا ہے۔ جب تک ہم اس نظامِ حکمت کے مرکز یعنی تصوّرِ خودی کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھیں‘ اقبال کے کسی تصوّر کو بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتے۔

خودی ہی کے دم سے زندگی اور اس کی قوتِ تسخیر ہے۔ خودی کے معنی ہیں اپنی فطرت پر برقرار رہنا اور اپنی ہستی کو مستحکم کرنا۔ جس کسی نے خودی کے اس سبق پر عمل کیا اس نے

گویا اپنے آپ میں تسخیر کی قوت پیدا کر لی۔ اقبال نے اس حقیقت کو چاند‘ زمین اور سورج کی مثال سے واضح کیا ہے۔ زمین کی ہستی چاند سے زیادہ محکم ہے‘ سو چاند زمین کے تابع ہے اور اس کے گرد گھومتا ہے۔ سورج کی ہستی زمین سے زیادہ محکم ہے‘ سو زمین اس کے تابع ہے اور اسی کے گرد گھومتی ہے۔

فرد کو لازم ہے کہ اپنی خودی کی تکمیل اور تربیت کرے‘ لیکن اگر وہ خودی کی حدود کے اندر رہے تو اس کی زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔ فرد کا رابطہ ملّت کے ساتھ نہایت ضروری ہے۔ اس کا وقار‘ اس کی عظمت‘ اس کا احترام ملّت کی وجہ سے ہوتا ہے ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے‘ تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

یہ تعلق فرد کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ’’شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔‘‘ یہاں ہم خودی کی منزل سے گزر کر بے خودی کی منزل میں آ پہنچتے ہیں۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

’’خودی جماعت کے اندر خود شکنی پیدا کر لیتی ہے تاکہ خودی پھول کی پتی سے باغ بن جائے۔‘‘

فرد می گیرد ز ملّت احترام
ملّت از افراد می باید نظام

’’فرد ملّت کی بنا پر عزّت حاصل کرتا ہے اور ملّت افراد کے مل جانے سے ترکیب پاتی ہے۔‘‘

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

’’فرد جب جماعت کے اندر گم ہو جاتا ہے تو وسعت کا متلاشی قطرہ بن جاتا ہے جو بڑھ کر سمندر کی شکل اختیار کر لے۔‘‘

خودی نہ بیچ....

ارسلان اللہ خان

علّامہ اقبالؒ نے ''خودی'' کا تصوّر سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ سے اخذ کیا۔ اس میں الفاظ آئے ہیں:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ﴾

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

از محبّت چوں خودی محکم شود قوتش فرمانده عالم شود

(اسرارِ خودی)

''جب عشق و محبّت کی بدولت خودی مضبوط ہو جاتی ہے تو اس کی قوت کائنات پر حکمرانی کرنے لگتی ہے۔''

خودی کے لغوی معنی ہیں ''اپنا آپ''، خود شناسی'' یا ''معرفتِ نفس''۔ خودی ایک فلسفہ ہے اور اس کے معارف سمجھانے کے لیے علّامہ اقبالؒ نے پوری ایک مثنوی ''اسرارِ خودی'' لکھی ہے۔ اس کے دیباچے میں خودی کا مفہوم ''احساسِ نفس'' اور ''یقینِ ذات'' بتایا گیا ہے۔ خودی نام ہے خود اعتمادی کا، خودداری کا، اور اللہ کی دی ہوئی قوت سے اپنی ذات پر بھروسا کرنے کا۔ کتاب ''روزگارِ فقیر'' (جلد اوّل) کے مطابق علّامہ اقبالؒ نے فرمایا: ''جو فعل خودی کو مستحکم کرے وہ حسین ہے، جو خودی کو ضعیف بنائے وہ قبیح ہے۔''

خودی کے تین مراحل ہیں: ۱) اطاعتِ الٰہی ۲) ضبطِ نفس ۳) نیابتِ الٰہی

خودی ایک ایسی اخلاقی قوت ہے جو انسانی زندگی کے بہترین مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ جس قوم میں خودی کی صلاحیت پیدا ہو جائے وہ ساری دنیا پر غالب آسکتی ہے۔

علّامہ اقبالؒ نے عشق کو خودی کی روح قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک خودی کی غذا بے نیازی

اور فقر ہے جبکہ سائل بن کر دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اس کی موت ہے۔ ایک مؤمن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ تقدیر کا بہانہ بنا کر تدبیر اور جُہدِ مسلسل کو ترک کر دے۔ علّامہ اقبال ایک نوجوان کو سخت کوش، محنتی اور خوددار دیکھنا چاہتے ہیں۔

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سِرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوِداں ہو جا

(طلوعِ اسلام: بانگِ درا)

آج ہمارے نوجوانوں کو بے شمار چیلنجز کا سامنا ہے۔ ایک طرف بڑھتی ہوئی بے روزگاری، مہنگائی اور پانی، بجلی، صحت اور تعلیم جیسی بنیادی سہولیات کا فقدان نظر آتا ہے تو دوسری جانب کرپشن، اقربا پروری، ناقدری جیسے مسائل ان کے سامنے عفریت بن کر کھڑے ہوئے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں نوجوانوں کا مایوس ہونا ایک فطری بات ہے، جسے علّامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے ذریعے اُمید میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

خودی ہو زندہ، تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر

(خودی کی زندگی: ضربِ کلیم)

علّامہ اقبال کا بیشتر کلام تبلیغِ خودی کا ایک دفتر ہے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلم نوجوانوں کو اپنی خودی سے آگاہ کریں تاکہ وہ کسرِ نفسی، عجز، بے بسی، بے چارگی اور خودشکنی کے تصوّرات کو ختم کر کے دنیا کو مسخر کر سکیں۔

علّامہ اقبال کو لندن میں جب اپنے بیٹے جاوید کا پہلا خط ملا تو انہوں نے ایک نظم بعنوان ''جاوید کے نام'' تحریر کی۔ یہ نظم ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے۔ پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم محض جاوید اقبال ہی کے لیے نہ تھی بلکہ اس میں پوری اُمّت کے نوجوانوں کے لیے خودداری، عزم، ہمت، خود شناسی اور خودی کا درس ہے۔ اسی نظم کا آخری شعر ہے:

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر!

یہاں امیری سے مراد دنیا کی محبّت جبکہ فقیری سے مراد روحانیت اور استغنا کی کیفیات ہیں۔ علّامہ اقبال کہتے ہیں کہ دُنیا کی محبّت میں گم ہو کر اللہ کو فراموش کر دینے سے انسان برباد ہو جاتا

ہے۔ جب ایک انسان دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو وہ اپنی ساری محنت اور صلاحیت اسی کو کمانے میں کھپا دیتا ہے' یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آجاتا ہے۔ پھر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾﴾ (التکاثر)

''غفلت میں رکھا تم کو کثرت کی خواہش نے۔ یہاں تک کہ تم قبروں کو پہنچ گئے۔''

ایک مسلمان کا طرزِ عمل یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ محض مال و دولت کمانے کے لیے اپنی خودی اور عزّتِ نفس کا سودا کردے۔ ایسا رزق جو مسلمان سے اس کی غیرت اور حمیت چھین لے' اس سے تو غریبی بہتر ہے۔ جب انسان زیادہ سے زیادہ کمانے کی ہوس میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ جائز' ناجائز اور حلال' حرام کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ ایسا فرد پہلے خود رشوت' سود خوری' ذخیرہ اندوزی' بخل اور بدعنوانی جیسے قبیح جرائم کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر اپنے ماتحتوں کو بھی انہی بداعمالیوں پر آمادہ کرتا ہے۔ اس طرح ایک شیطانی چکّر وجود میں آتا ہے جس سے ملک کی معیشت کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے جس سے ریاست میں ایسے جرائم جنم لیتے ہیں جنہیں روکنا مشکل ہوجاتا ہے۔

آج بحیثیت اُمّت ہمارا حال سب کے سامنے ہے۔ ہم اپنے مقام سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ اسلامی ممالک کی تعداد کم و بیش ۵۷ ہے لیکن طاغوت کے سامنے سب بے بس نظر آتے ہیں۔ تعیّشات اور اغیار پر انحصار نے اُمّت کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ آج مختلف بین الاقوامی ادارے جب چاہتے ہیں مسلم ممالک پر کوئی نہ کوئی پابندی لگا دیتے ہیں۔ مسلم ممالک کو قرضہ دینے کے عوض ان کے ضمیر کا سودا کرلیا جاتا ہے۔ علّامہ اقبال چونکہ حکیم الامّت تھے اسی لیے وہ اپنی حکمت اور دُور رس نگاہ سے سمجھ چکے تھے کہ مسلمانوں کو ہرگز مغربی ممالک کا دستِ نگر نہیں بننا چاہیے بلکہ خود انحصاری پر توجّہ دینی چاہیے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جتنے وسائل بھی میسّر ہوں انہی کو بروئے کار لاکر ریاست کو خودمختار بنایا جائے تاکہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس کوشش میں وقتی طور پر مصائب کا سامنا تو ہوگا لیکن یہ دوسروں کی امداد کے برتے پر ترقّی کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

آج دنیا بھر میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے لیکن اسلامی ممالک کی تنظیم OIC کوئی عملی کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کے حکمرانوں نے اپنے ذاتی

مفادات کے مدِّنظر اپنی خودی کا سودا کرلیا ہے جس کے بعد وہ اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کرنے کے بجائے اغیار کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ ضربِ کلیم میں اقبال اپنی ایک نظم ''گلہ'' میں فرماتے ہیں:

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے' یورپ سے نہیں ہے

علّامہ اقبالؒ چاہتے ہیں کہ مسلمان مغرب کی چکاچوند سے متاثر نہ ہوں کیونکہ اس ترقی کی بنیاد دراصل مادّہ پرستی' لالچ اور ہوس پر ہے۔ جب تک مسلمان ان چیزوں سے بے نیاز رہے کوئی انہیں زیر نہیں کرسکا' لیکن جب دنیا کمانے کے لیے اپنی عزّتِ نفس کا سودا کرنا شروع کیا تو وہ زوال پذیر ہوگئے۔ علّامہ اقبال کی آرزو ہے کہ مسلم نوجوان اپنی تہذیب' ثقافت اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم کو مشعلِ راہ بنا کر خود میں ایسی صفات پیدا کریں کہ ایک بار پھر دنیا کی قیادت ان کو میسّر آجائے۔ علّامہ اقبالؒ نے نوجوانوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لیے انہیں 'شاہین' سے تشبیہ دی' کیونکہ خودی کے اوصاف کا عملی نمونہ اگر کسی میں نظر آتا ہے تو وہ یہی پرندہ ہے۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دَم ہے اگر تُو' تو نہیں خطرۂ اُفتاد
(اَسرارِ پیدا: ضربِ کلیم)

شاہین میں مندرجہ ذیل پانچ خوبیاں ہیں: ۱) بلند پروازی ۲) تیز نگاہی ۳) خلوت پسندی ۴) آشیانہ نہ بنانا ۵) کسی اور کا کیا ہوا شکار نہ کھانا —— علّامہ اقبالؒ چاہتے ہیں کہ مسلم نوجوان شاہین صفت اور بلند پرواز ہوں۔ یہ نوجوان ایسے ہوں جنھیں دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوجائے۔ دوسری قوموں کے نوجوانوں کے مقابلے میں یہ اپنے اعمال' اخلاق اور کردار سے نمایاں نظر آئیں۔ ایک مسلمان نوجوان کی یہ شان نہیں کہ وہ تقدیر کا بہانہ بنا کر تدبیر سے ہی ہاتھ اٹھالے۔ اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے مطابق نوجوانوں کی کامیابی عملِ پیہم' خوداعتمادی' مقصد سے عشق' صبر اور جستجو میں ہے۔ جب جوانوں میں خودی کا جذبہ جنم لیتا ہے تو اس کا نتیجہ کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے:

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
(اَسرارِ پیدا: ضربِ کلیم)

❀❀❀

اسلامی اخوت کے تقاضے

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام کو دینِ فطرت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا' کیونکہ اس کا کوئی اصول اور ضابطہ ایسا نہیں جس سے فطرت اِبا کرتی ہو۔ اچھا اخلاق انسانیت کا زیور ہے۔ ہر مسلمان کو اخلاقِ حسنہ کی تلقین کی گئی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ معلم اخلاق تھے۔ آپؐ کی تعلیم اچھے اخلاق پر مبنی تھی۔ جب آپ ﷺ مکّہ کے ایک عام فرد تھے اور آپؐ پر نبوت کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی تھی' اس وقت بھی آپؐ کی حیثیت یہ تھی کہ مکّہ کے لوگ آپؐ کو صادق اور امین کہتے تھے۔ بعثت کے بعد جب آپ ﷺ نے توحید باری تعالیٰ اور اسلامی تعلیمات کو فروغ دینا چاہا تو وہی لوگ آپؐ کے مخالف ہو گئے۔ آپ ﷺ نے اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت پر صبر کیا اور دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مدد کی اور آپؐ کو ایسے ساتھی فراہم کیے جو آپؐ کے دست و بازو بن گئے۔ سخت مخالفت کے باوجود ایک دن ایسا آیا کہ دینِ اسلام آپ ﷺ کے حین حیات جزیرہ نما عرب میں غالب آ گیا۔

جب انسان نے دینِ اسلام قبول کر لیا تو اس کے لیے لازم ہوا کہ وہ اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جو سراسر فطری خوبیوں پر مبنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دین کامل بنایا اور اس کے اصول اور ضابطے رسول اللہ ﷺ کو تعلیم کیے۔ مواخاتِ اسلام کی وہ تعلیم ہے جو کسی دوسرے مذہب یا قوم کے ہاں موجود نہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (الحجرات:۱۰) ''مؤمن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' اس تعلیم کو رسول اللہ ﷺ نے عملاً رائج فرمایا اور آپؐ کے اصحاب آپس میں ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ کا مصداق بن گئے۔

مکّہ میں جب رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کا رہنا ممکن نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہجرت کا حکم دیا۔ اول آپؐ کے اصحاب مدینہ ہجرت کرنے لگے۔ پھر حضور ﷺ نے

بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیّت میں سفر ہجرت اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مدینہ کی صورت میں اچھا ٹھکانا عطا فرمایا۔ مکّہ سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمان اپنا گھر بار' عزیز رشتہ دار' کاروبار اور جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کا نفاذ کرتے ہوئے حضورِ اَقدس ﷺ نے مہاجرین کو مدینہ کے باسی مسلمانوں کا بھائی بنا دیا' جنہوں نے بھائی چارے کا حق ادا کر دیا۔ مدینہ کے مسلمانوں کو انصار کہا گیا کہ انہوں نے مہاجرین کو ہر طرح سے سنبھالا دیا اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ مواخات کا یہ سبق دین اسلام کا طُرّۂ امتیاز ہے۔ ایک مہاجر کو ایک انصاری کے سپرد کر کے ان میں اخوت کا رشتہ قائم کر دیا گیا۔ انصارِ مدینہ نے اپنے حسنِ سلوک سے اس بھائی چارے کو مثالی بنا دیا۔ مہاجرین کو ہر طرح سے سہولت دی۔ ایسی مثال بھی ملتی ہے کہ ایک انصاری کی اگر دو بیویاں تھیں تو انہوں نے اپنے مہاجر بھائی کو یہ پیشکش کی کہ میں اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں' آپ اس کے ساتھ شادی کر لیں۔ مہاجرین اور انصار کا یہ بھائی چارا جب پختہ ہو گیا تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ کہیں انصار اپنی جائیدادوں میں بھی مہاجرین کا حصہ مختص نہ کر دیں۔ چنانچہ پھر ربّ العزت کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ مہاجر بھائی کو انصاری بھائی کی وراثت کا حق دار نہ بنایا جائے۔

اس اسلامی اخوت کو مضبوط کرنے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات شاہد ہیں۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَرَاحُمِھِمْ وَتَوَادِّھِمْ وَتَعَاطُفِھِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ' اِذَا اشْتَکٰی عُضْوًا تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّھَرِ وَالْحُمّٰی))(بخاری ومسلم)

''ایمان والوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کھانے' محبّت کرنے اور شفقت و مہربانی کرنے میں تم جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ جب اس کے کسی ایک عضو کو بھی تکلیف ہوتی ہے تو جسم کے باقی سارے اعضاء بھی بخار اور بے خوابی میں اُس کے شریک حال ہو جاتے ہیں۔''

گویا رسول اللہ ﷺ نے واضح کر دیا کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان اخوت کا رشتہ وقت کی ضرورت تھا' مگر اس اخوت کو ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کے درمیان مستقلاً قائم کر دیا۔ اس کا مظہر یہ ہے کہ کسی ایک مسلمان کو تکلیف ہو تو دوسرے مسلمان اس کو اپنی تکلیف سمجھیں اور اس کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ یہ جذبہ مسلمانوں کے دعوائے ایمان کی دلیل ہے' ورنہ ایمان کا

دعویٰ خام ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا' ثُمَّ شَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ))

(رواہ البخاری و مسلم)

''ایمان والوں کا تعلق دوسرے ایمان والوں سے ایک مضبوط عمارت کے اجزاء کا سا ہونا چاہیے کہ وہ باہم ایک دوسرے کی مضبوطی کا ذریعہ بنتے ہیں (اور ان کے جڑے رہنے سے عمارت کھڑی رہتی ہے)۔ پھر آپؐ نے (ایمان والوں کے اس باہمی تعلق کا نمونہ دکھانے کے لیے) اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال دیں (اور بتایا کہ مسلمانوں کو اس طرح باہم مل کر ایک ایسی مضبوط دیوار بن جانا چاہیے جس کی اینٹیں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوں اور کہیں ان میں کوئی خلا نہ ہو)۔''

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا خیر خواہ ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرتے ہیں۔ بھائی چارے کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو دُکھ میں دیکھے تو اس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرے' بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کرے اور علاج معالجے میں اس کی مدد کرے۔ ایسا کرنے پر اسے بھرپور اجر و ثواب کی نوید سنائی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو اس کے دشمنوں کے سپرد کرے' اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی میں ہوتا ہے' اور جو شخص مسلمانوں سے تکلیف اور مشقّت دُور کرے اللہ قیامت کی مشکلوں میں سے اس کی مشکل اور تکلیف دور فرماتا ہے' اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔'' (بخاری و مسلم)

ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی کمزوریوں' خطاؤں اور گناہ کے کاموں سے دوسرے لوگ واقف نہ ہوں۔ چنانچہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی پردہ پوشی کرے' جس کا اجر اُسے قیامت کے دن ملے گا کہ اس کے گناہوں سے پردہ پوشی کی جائے گی اور اسے رسوائی سے بچایا جائے گا۔ اسی طرح جو کسی تنگ دست بھائی کی تنگ دستی دور کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں آسانی پیدا کرے گا۔

مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے محبّت کریں۔ ان کی یہ محبّت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

کے لیے ہوگی تو ان کے لیے نور کے منبر ہوں گے اور ان کو اتنا اعزاز ملے گا کہ نبی اور شہید بھی ان پر رشک کریں گے۔ (رواہ الترمذی' عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ)

مسلمان کی تو شان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے (مسلمان) بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' (صحیح بخاری)

حقیقت میں مسلمان وہی ہے جو دوسرے مسلمانوں کو کسی بھی طرح کی تکلیف نہ دے۔ مشہور حدیث ہے: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ)) (متفق علیہ)

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان امن میں ہوں۔''

مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا ہمہ وقت خیر خواہ ہو۔ حضرت اُمّ الدرداء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ کسی مسلمان شخص کی وہ دعا جو اس نے اپنے مسلمان بھائی کے لیے اس کی غیر حاضری میں کی ہو (اللہ کے ہاں) قبول ہوتی ہے اور ایک فرشتہ اس کی دعا پر آمین کہتا ہے۔ (صحیح مسلم)

اسلامی اخوت کی تاکید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے فرمودات نقل کیے گئے ہیں۔ بشری تقاضے کے تحت دو مسلمانوں میں شکر رنجی ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت کا علم ہونے پر ضروری ہے کہ ان کے درمیان مصالحت کی کوشش کی جائے۔ یہ اخلاقی صفت کا بہت اونچا مقام ہے۔ اس سے مخالفت یا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے' ورنہ بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا مَیں تمہیں وہ چیز نہ بتاؤں جو درجے میں روزوں' نماز اور صدقے سے افضل ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ! (ضرور بتایئے) آپؐ نے فرمایا: ''آپس میں صلح کرا دینا۔'' نیز فرمایا: ''آپس کی لڑائی اور بے اتفاقی مونڈنے والی ہے''۔ (ابوداؤد) یعنی مؤمنوں کے درمیان باہمی بے اتفاقی نیکیوں کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے۔

الغرض اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں اور ہر کوئی دوسرے کا ہمدرد اور غم گسار ہو۔

❁❁❁

تحریکِ صہیونیت: کل اور آج

رضی الدین سید☆

لفظ ''صہیونیت''، ''یہودیت'' سے الگ ایک اصطلاح ہے۔ یہودیت ایک مذہب یا قومیت کا نام ہے جبکہ صہیونیت ایک تحریک ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پاکستان ایک ملک کا نام ہے جبکہ تحریکِ پاکستان ایک تحریک تھی جس کا نصف سفر حصولِ پاکستان کے بعد ختم ہوگیا۔ صہیونیت کا ایک بڑا مقصد یہودیوں کے لیے ایک الگ مملکت کا قیام تھا' لیکن اس کے دیگر خفیہ و علانیہ مقاصد اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں۔ صہیونی زعماء اپنی اس تحریک کو علامتی طور پر ایک زندہ سانپ سے ظاہر کرتے ہیں جس کا سفر کبھی انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوا تھا لیکن جو دجال کی آمد کے بعد تک بھی جاری رہے گا۔

زیرِنظر مضمون میں ہم ''تحریکِ صہیونیت'' کا ایک جائزہ یہودی اور عمومی دونوں نقطہ ہائے نگاہ سے لیں گے۔

تحریکِ صہیونیت: کل (یہودی نقطۂ نظر)

یہودیوں کے لحاظ سے اس تحریک کا اصل مقصد دنیا بھر میں بکھرے ہوئے اور اپنے راندۂ درگاہ ہم قوموں کے لیے خاص فلسطین کے اندر ایک مکمل و خودمختار مملکت کا حصول تھا جہاں وہ اپنی روحانی و مذہبی اقدار کو بحیثیت قوم بحال کرسکیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ جو لوگ تحریک صہیونیت کو یہودی نسل پرستی سے تعبیر کرتے ہیں' ایک بہت بڑا جھوٹ بولتے ہیں۔

''صہیونیت'' دراصل لفظ ''صہیون'' (Zion) سے نکلا ہے جو یروشلم میں ایک پہاڑی کا نام ہے۔ اس کا ذکر عہد نامہ قدیم میں بار بار آتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر حضرت داؤد علیہ السلام عبادت بھی کیا کرتے اور حکومت بھی سنبھالا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کے دیگر انبیاء نے بھی اس پہاڑی کا

☆ای میل: national.a.research@gmail.com

نام استعمال کر کے یہودیوں کو مذہبی و روحانی طور پر خود کو تبدیل کرنے کی دعوت دی تھی۔ حضرت ایسعیاہ پیغمبر کہتے ہیں: ''کیونکہ صہیون سے شریعت' اور یروشلم سے خداوند کا کلام صادر ہوگا۔'' (کتاب ایسعیاہ: ۲'۳) یا جیسے کتاب ''نوحہ'' میں دیا ہوا ہے: ''انہوں نے صہیون میں عورتوں کو بے حرمت کیا۔'' (۵:۱۱)

۵۸۶ ق م میں جب اہلِ بابل نے یروشلم اور ہیکل کو لوٹ کر برباد کر دیا تو صہیون کے لفظ کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ اب اس کا مطلب سرزمین یروشلم کی جانب دوبارہ لوٹ جانے کے لیے یہودیوں کی آہ و بکا اور فریاد و فغاں ہوگیا۔ کتاب زبور کہتی ہے: ''اور ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے اور صہیون کو یاد کر کے روئے۔ اے یروشلم! اگر میں تجھے بھولوں تو میرا دایاں ہاتھ اپنا ہنر بھول جائے۔ اگر میں تجھے یاد نہ رکھوں' اگر میں یروشلم کو اپنی بڑی خوشی پر ترجیح نہ دوں تو میری زبان میرے تالو سے چپک جائے۔'' (زبور: ۱۳۷)

بعد ازاں ۷۰ء میں رومی لشکروں کے ہاتھوں یروشلم اور ہیکل کے ساتھ ایک بار پھر وہی سلوک ہوا جس کے تحت ہزاروں یہودیوں کو تہِ تیغ اور لاکھوں لوگوں کو دربدر کیا گیا۔ اس کے بعد سے صہیون پھر گویا آہ و فغاں کی ایک مضبوط علامت بن گیا۔ یہود کی دیگر مذہبی کتابوں میں بھی صہیون اور یروشلم کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا جانے لگا اور روزانہ اسے یاد رکھنے کی ہدایت کی جانے لگی۔ روزوں میں' ایامِ سبت میں' شادی بیاہ میں' اور سہ وقتہ نمازوں میں صہیون کی طرف لوٹ جانے کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ شادی بیاہ کی کوئی تقریب بغیر اس ''تمنّائے بلند آواز'' کے کہ ''مسرّت اور خوشیوں کی یہ صدائیں کاش ہم ایک بار پھر یروشلم کی گلیوں میں سن سکیں'' مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ غم و اندوہ کا کوئی واقعہ اور کوئی نوحہ ''فریادِ صہیون'' کے بغیر تکمیل پاتا تھا اور نہ کسی مکان کی تعمیر ہیکل کی تعمیرِ نو کی تمنّا کے بغیر مکمل سمجھی جاتی تھی۔ ہر اہم تقریب کے بعد یہودی یہ نعرہ ایک بار ضرور بلند کرتے تھے: ''اگلا سال یروشلم میں اے خدا!''

یہودی عقیدے کا یہ ایک لازمی حصّہ بن گیا تھا کہ ارضِ موعودہ فلسطین اور قومِ یہود کسی بھی لحاظ سے دو مختلف معاملات نہیں ہیں۔ یہودی فلسطین ہیں اور فلسطین یہودی ہے۔ صہیونیوں کے بقول دنیا کی کسی بھی دوسری قوم نے مذہبی اور ثقافتی لحاظ سے صہیون و یروشلم کو اپنی زندگی میں وہ اہمیت نہیں دی جس قدر یہودی قوم نے اپنی روزمرہ زندگی میں دی ہے' حالانکہ بار بار کی بربادی'

ویرانی‘ آگ لگائے جانے‘ کھدیڑ دیے جانے‘ اور غلام بنا لیے جانے کے بعد تو یہودیوں کو یروشلم کو بالکل بھول ہی جانا چاہیے تھا۔

معروف مصنفہ کیرن آرم سٹرانگ کہتی ہے: ’’۱۹۶۷ء کی مصر اسرائیل جنگ کے بعد ایک بڑے فوجی ربی شلومو گورئین نے یروشلم میں بہت سارے یہودی جمع ہو جانے پر جب پہلی دفعہ دیوارِ گریہ پر عبادتی ’’شوفر‘‘ (ناقوس) بجایا تو نوجوان یہودی سپاہی دیوارِ گریہ کے پتھروں سے لپٹ کر رونے لگے۔ ربّی نے شوفر کے بعد جب زبور کی تلاوت شروع کی تو دہریئے فوجی افسران تک بھی خوشی سے بے قابو ہونے اور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ ایک نوجوان کا کہنا تھا کہ اس کے بدن میں مرچیں لگ رہی تھیں اور سر چکرانے لگا تھا۔ یہ ایک ڈرامائی اور اَن دیکھی واپسی تھی جو یہودیوں کی قدیم مذہبی داستانوں کی ایک نئی تصویر تھی۔‘‘ (یروشلم: ایک شہر‘ تین مذاہب۔ مصنفہ: کیرن آرم سٹرانگ۔ صفحہ ۶۱۰)

’’صہیونیت‘‘ کی اصطلاح اگرچہ سب سے پہلے ایک سرگرم یہودی Nathan Birnbaum نے متعارف کروائی تھی لیکن اس کا اصل اور مقبولِ عام استعمال دراصل تھیوڈور ہرزل نے کیا تھا۔ یہودی تاریخ کے مطابق یہ شخص ایک صحافی تھا۔ عیسائیوں کی جانب سے یہودیوں کے خلاف چلائے جانے والے ایک مقدّمے میں اس نے جب اپنی قوم کی بے بسی اور مظلومیت کو دیکھا تو اسی وقت اس کے دل میں یہ خیال راسخ ہوا کہ قومِ یہود کی اس عالمی ذلت و رسوائی کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ان کے لیے ایک آزاد و خود مختار وطن حاصل کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے ایک تحریک شروع کی جسے صہیون پہاڑی سے منسوب کر کے ’’تحریکِ صہیونیت‘‘ کا نام دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس جذباتی نام سے دنیا بھر کے یہودیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا اور پھر علیحدہ ریاست حاصل کرنا ممکن ہو جائے گا۔ اس کی یہ سوچ بالکل درست ثابت ہوئی اور پھر ع ’’لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا‘‘ کے مصداق تحریک تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ اسی باعث تھیوڈور ہرزل کو ’’بابائے صہیونیت‘‘ کے خطاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اپنی فکر و نظر کو مزید مضبوط کرنے کے لیے اس نے ۱۸۹۶ء میں ’’یہودی ریاست‘‘ یا Der Judenstaat کے نام سے ایک ضخیم کتاب بھی لکھی۔ صہیونیوں کے نزدیک نہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک صہیونی تھے‘ بلکہ نعوذ باللہ! خود خدا بھی

صہیونی ہے۔ (جیوئش ہسٹری اینڈ کلچر‘ از ربی بنجامن بلیخ‘ ص: ۲۹۴)

یورپ میں عیسائیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی صدیوں قدیم درگت و ہلاکت نے بہرحال ہرزل کے اس نظریے کو فوری مقبولیت عطا کی۔ نیز انیسویں صدی کے آغاز ہی سے یورپ میں قومیت کا جو احساس پیدا ہونا شروع ہوا تھا‘ اس نے بھی یہودی قومیت و وطنیت کے تصوّر کو بہت راسخ کیا۔ ہرزل کے نظریات کی پذیرائی کا وقت اب آ چکا تھا۔ اپنے کام کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اس نے World Jewish Organization کے نام سے ایک نئی تنظیم بھی قائم کی جس کا پہلا اجلاس باسل‘ سوئیزرلینڈ میں ۱۸۹۷ء میں منعقد کیا گیا۔ اوّل اوّل تو اس کا خیال تھا کہ نئی یہودی ریاست کا قیام فلسطین ہی میں ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے تجویز پیش کی کہ مجوزہ یہودی ریاست افریقہ کے ملک یوگنڈا میں قائم کی جائے (جس کی تائید عیسائیوں نے بھی کی تھی)۔ تاہم صہیونیوں کی شدید مخالفت کے باعث ہرزل اپنی اس تجویز سے دستبردار ہو گیا۔ بہرحال اس اجلاس میں پہلی بار باقاعدہ طور پر ’’فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک علیحدہ آزاد ریاست‘‘ کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی تھی۔ اس کے بعد تو بس صورتِ حال یہ ہو گئی تھی کہ ’’چلو چلو‘ فلسطین چلو‘‘۔ عبرانی زبان میں اس نقل مکانی کو Aliyah (بلندی‘ ہجرت) کا نام دیا گیا۔ اگرچہ لاتعداد ربیوں اور تورات کے عالموں نے اس ریاست کے تصوّر کی مخالفت بھی کی تھی‘ تاہم ان لوگوں کی یہ آواز محض صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی۔

پھر اسرائیل دائیں بازو اور دائیں بازو‘ سرمایہ دار اور غیر سرمایہ دار‘ قدیم اور جدید ہر قسم کے یہودیوں کا جزوِ ایمان بن گیا۔ یہودی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہی جا کر کہیں یہودیوں میں اعتماد پیدا ہوا۔ وہ باہم متحد ہوئے اور اپنی قدیم زبان‘ مذہب‘ رسوم و روایات کو زندہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

تحریکِ صہیونیت: آج (عمومی نقطۂ نظر)

اسرائیل حاصل کر کے صہیونیت نے اگرچہ اپنا ایک بڑا مقصد حاصل کر لیا ہے لیکن اس سفر کو اب تک ختم نہیں کیا ہے۔ اس کا اصل مقصد دجال کے ماتحت ایک عالمی یہودی ریاست کا قیام ہے جس کے بعد نہ تو کوئی انفرادی فوج باقی رہے گی‘ نہ کوئی الگ ملک پایا جائے گا‘ اور نہ کوئی دوسرا مذہب قائم رہنے دیا جائے گا۔ ان کی تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ یہ دنیا محض اسرائیلیوں

کے لیے تخلیق کی گئی ہے جس پر چوپایوں اور ذلیلوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ قیامِ اسرائیل کے بعد عیسائیت سے انتقام کی خاطر انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کے مذہب کو دو بڑے حصوں‘ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ‘ میں تقسیم کر دیا بلکہ ان کے درمیان دو عالمی جنگیں بھی برپا کروائیں۔ تمام عیسائی بادشاہوں کو اپنے قرضوں میں جکڑا۔ ان کی پاپائیتِ اعظم کے اصل ادارے میں نفوذ کیا۔ ۱۹۶۰ء میں پاپائے اعظم سے ان کے پیغمبر کی تصلیب کا قدیم ترین الزام برسرِ عام دھلوایا۔ اپنے مفادات کی خاطر اقوامِ متحدہ کا ادارہ قائم کیا۔ ’’ہولوکاسٹ‘‘ کا بے جا عالمی پروپیگنڈا کر کے دنیا بھر سے اپنے حق میں ہمدردی سمیٹی۔ بیشتر عیسائی مملکتوں میں ہولوکاسٹ کے خلاف لکھنا اور بولنا آئینی جرم قرار دلوایا۔ فلسطین کے قدیم عرب مسلم باشندوں کو وطن سے نکال باہر کیا۔ فحاشی و عریانی کو سرکاری پالیسی کے طور پر دنیا بھر میں رواج دیا۔ مسلم ریاستوں کے سربراہوں کو خریدا۔ مسلمانوں کی وسیع و عریض سلطنت ’’خلافت عثمانیہ‘‘ کو تار تار کیا۔ اب قدیم ترین عبادت گاہ مسجدِ اقصیٰ کو گرا کر وہاں ایک نیا ہیکل تعمیر کرنے اور تیسری ایٹمی جنگ برپا کرنے کے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ صہیونی کبھی کہا کرتے تھے کہ ان کی تحریک کو نسل پرستی کی تحریک قرار دینا غلط ہے جبکہ موجودہ صہیونی (اسرائیلی) پارلیمنٹ نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے اسرائیل کو باقاعدہ طور پر ایک یہودی ریاست قرار دے دیا ہے۔ نیز فلسطینیوں کو اب سپریم کورٹ میں اپیل کے حق سے بھی محروم کر دیا ہے۔ فلسطینی اپنے ہی ملک میں تقریباً ستّر لاکھ یہودیوں کے مقابلے میں اب محض بیس لاکھ رہ گئے ہیں۔ یہ کل آبادی کا کم و بیش تیس فیصد ہیں‘ لیکن اس کے باوجود ان کے تمام حقوق پر بلڈوزر پھیر دیا گیا ہے۔

اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی پادری جرمیاہ رائٹ کہتا ہے: ’’دو سو سال قبل امریکا کے بانیوں نے عدل و انصاف‘ مساواتِ انسانی اور اصولِ قوانین کے جو خواب دیکھے تھے‘ یہودیوں اور صہیونیوں نے انہیں چکنا چور کر دیا ہے۔ یہودی امریکہ کو مادہ پرستی کی طرف لے گئے۔ اسلحہ سازی کو کھربوں ڈالر کا کاروبار بنا دیا جسے چلانے کے لیے یہودی سرمایہ کار امریکی حکومتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ دنیا بھر میں محاذِ جنگ کھولے رکھیں۔‘‘ (بساطِ عالم کے مہرے: ولیم گائی گار۔ ترجمہ راقم۔ اوریئنٹل پبلیکیشنز لاہور)

صہیونیت اب نام رہ گیا ہے فلسطین پر مکمل قبضے کا‘ دھوکے بازی اور نسل پرستی کا‘ پُرفتن

سازشی منصوبوں پر عمل درآمد کا‘ اجتماعی قتل و غارت گری کا‘ ذرائع ابلاغ اور عالمی مالیات پر قبضے کا‘ غلاموں اور منشیات کی گھناؤنی تجارت کا‘ دنیا بھر کے انسانوں کو تقسیم در تقسیم کرنے کا‘ امنِ عالم کو تار تار کر دینے کا‘ اقوامِ متحدہ سے اپنی مرضی و منشا کے مطابق فیصلے کروانے کا!

کل تک ساری مغربی دنیا یہودیوں کو اپنی نفرتوں کا نشانہ بنایا کرتی اور انہیں چُن چُن کر ہلاک کیا کرتی تھی۔ آج وہی ان کی بندۂ بے دام بنی ہوئی خود انہی کی نفرت و انتقام کا نشانہ بن رہی ہے۔ عالمی معاملات آج مکمل طور پر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ عیسائی دو ارب سے بھی زائد ہو کر ان کے غلام بنے ہوئے ہیں جبکہ یہودی ڈیڑھ کروڑ ہو کر بھی ساری دنیا کو اپنے قبضے میں لیے ہوئے ہیں۔

مغرب ہی کی مانند صہیونیت نے مسلم دنیا کو بھی گزشتہ سالوں میں بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنی مٹھی میں کر لیا ہے۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ عیسائی صہیونیت کی مانند عرب حکمرانوں میں ’’مسلم صہیونیت‘‘ بھی گھر کر گئی ہے۔ فلسطینیوں کے حقوق پر ڈٹے رہنے والی عرب حکومتوں کو آج صہیونی موقف بالکل درست نظر آ رہا ہے جبکہ فلسطینی انہیں غلط نظر آ رہے ہیں۔ مسلمان اور صہیونیت سے دوستی! یہ سننے ہی میں عجیب سا لگتا ہے مگر مسلم صہیونیت کو اب ہم نے بھی شاید قبول کر لیا ہے۔ مصر کے بعد یکے بعد دیگرے تمام عرب ممالک اسرائیل کے حقِ ریاست کے بارے میں زور شور سے آواز اٹھانے لگے ہیں‘ اسی طرح جیسے امریکی پادری اسرائیل کے حق میں مہم چلاتے ہیں اور جھولی بھر بھر کے فنڈ دلواتے ہیں۔ اپنے آباء کے اس موقف کی بھی کہ ’’اسرائیل مشرقِ وسطیٰ میں ایک رستا ہوا ناسور ہے‘‘ عرب حکمرانوں کو کوئی پروا نہیں ہے۔ آج ان کے ہاں باقاعدہ طور پر اسرائیل کے سفارت خانے کھل چکے ہیں اور کمرشل پروازوں کی آمد و رفت جاری ہو چکی ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس نے تمام مسلم ممالک کے منہ پر کالک مل دی ہے۔ سعودی عرب حرمین شریفین کے باعث کچھ مجبور سا ہے‘ تاہم اس کی بھی اندرونی ہمدردیاں مظلوم فلسطینیوں کی بجائے جارح صہیونیوں کے ساتھ ہی ہیں۔

تحریکِ صہیونیت کل بھی ناپاک منصوبوں میں ہمہ تن مصروف تھی اور آج بھی اس کے مقاصد وہی ہیں۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ اس ضمن میں ہمارا مقام کیا ہے؟ صہیونیت ایک ایسا سیلابِ بلا ہے جس نے مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کو روند ڈالا ہے۔ یہ ایک ایسی انسانیت

دشمن تحریک ہے جو نہ سرنگوں ہونا جانتی ہے اور نہ پسپا ہونا۔ جو بھی ہدف طے کرتی ہے اسے حاصل کیے بغیر چین نہیں پاتی۔ اس پر مستزاد یہ کہ سب کچھ بغیر شور شرابے اور بغیر ڈنکا بجائے چپکے چپکے کرتی ہے۔

مسلم دنیا کے لیے یہ پہلو اگرچہ تشویش کا ہے لیکن اس کے دانشوروں اور مفکروں کو یقین ہے کہ یہ صہیونیت بالآخر پاش پاش ہو گی' بالکل اسی طرح جیسے کل تاتاری اور چنگیز ساری دنیا پر بربادیاں مسلّط کر کے بالآخر مسلمانوں ہی کے آگے ڈھیر ہوئے تھے۔ ان کی دوسری اور تیسری نسل نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی اسلام کو تقویت پہنچانے میں جُت گئے تھے جسے مٹانے کی خاطر وہ کبھی دن رات مصروف رہا کرتے تھے۔ ع ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!'' اسی طرح جیسے گزشتہ تقریباً ایک صدی کے دوران تمام مغربی استعماری قوتیں افغانستان میں آنے کے بعد اپنے اپنے قبرستان سجا کر رخصت ہوئی ہیں' صہیونی تحریک کا انجام بھی بالآخر یہی نظر آ رہا ہے!

یہ دعویٰ ہرگز غلط نہیں کہ اُدھر صہیونیت کا مستقبل گہرے اندھیروں میں ڈوبا نظر آ رہا ہے اور اِدھر اسلام کا مستقبل تابناک دکھائی دے رہا ہے۔ ہوگا آخر یہی کہ صہیونیوں کو خود اسرائیل میں اور عیسائیوں کو خود واشنگٹن میں کہیں جائے پناہ نہ مل سکے گی۔ ع ''تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے!'' ❁❁❁

بقیہ: قرآن کا تصوّرِ علم

عربی زبان میں عقل اس صلاحیت یا اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو خالقِ کائنات کی سمت بتائے یا اس سے باندھے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ لاطینی الفاظ Intellctus or Nous & Ratio (reason) کے مترادف ہے۔ ازروئے قرآن عقل (عقلِ سلیم) انسان کو صراطِ مستقیم سمجھا کر اُخروی کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ وحی الٰہی عقل کی اس استعداد کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ اگر عقل پر جذبات اور شہوات کے پردے پڑ جائیں اور نفسِ امّارہ اس پر غالب آ جائے تو عقل انسانی حقیقت سے محجوب ہو جاتی ہے۔

قرآنی نظریہ علم کی ایک کلید لفظ ''تذکّر'' اور اس کے مشتقات پر غور کرنے سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ تذکّر' ذکر' تذکیر قرآن کی انتہائی اہم اصطلاحات ہیں۔ ❁❁❁

تفسیر کے ناقابلِ اعتبار مآخذ

بسلسلہ علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام (۷)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

علمِ تفسیر کے معتبر اور مستند مآخذ معلوم ہونے کے بعد ان ناقابلِ اعتبار مآخذ کی نشاندہی بھی ضروری ہے جنہیں بعض لوگ قرآنی تفسیر کی بنیاد قرار دے کر غلط فہمیوں بلکہ بعض اوقات گمراہیوں کا خود بھی شکار ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی کرتے ہیں۔ یہ ناقابل اعتبار مآخذ درج ذیل ہیں:

(۱) اسرائیلیات

یہ لفظ اسرائیلی روایات کے لیے بولا جاتا ہے‘ یعنی ایسی روایات جو یہودیوں یا عیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہوں۔ ان میں سے بعض براہِ راست بائبل (تورات‘ انجیل اور دیگر مقدس کتابوں کا مجموعہ) یا تالمود (کتبِ مقدسہ کی شروح کا مجموعہ) سے لی گئی ہیں‘ بعض مشنا اور ان کی شروح سے اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہلِ کتاب میں سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں اور عرب کے یہود و نصاریٰ میں مشہور و معروف تھیں۔ قدیم تفسیر کی کتابوں میں ایسی روایات کی ایک بھاری تعداد موجود ہے۔ ایسی روایات کا حکم بیان کرتے ہوئے مشہور محقّق و مفسّر حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اس طرح کی روایات تین اقسام کی ہیں اور ہر قسم کا حکم علیحدہ ہے:

(ا) پہلی قسم کی وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہو چکی ہے‘ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ‘ فرعون کا غرق ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر جانا وغیرہ۔ ایسی روایات اس لیے قابلِ اعتبار ہیں کہ قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ نے ان کی تصدیق کر دی ہے۔

(ب) دوسری قسم کی وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹا ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے‘ مثلاً یہ قصہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذ اللہ!) بُت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ روایت اس لیے قطعی طور پر باطل ہے کہ قرآن پاک نے صراحتاً اس کی تردید کی ہے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ مَن گھڑت کہانی کہ آپؑ (معاذ اللہ!) اپنے سپہ سالار ’اوریا‘ کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔

(ج) تیسری قسم کی وہ اسرائیلیات ہیں جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ جھوٹی ہیں‘ مثلاً تورات کے احکام وغیرہ۔ ایسی ہی اسرائیلیات کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ”لَا تُصَدِّقُوْهَا وَلَا تُكَذِّبُوْهَا“ (نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو۔)

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے لیکن نہ ان پر کسی دینی مسئلے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان کی تصدیق یا تکذیب کی جا سکتی ہے‘ اور پھر اس قسم کی روایت بیان کرنے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے۔ ابن کثیر کا اپنے مقدمۂ تفسیر میں کہنا ہے کہ خود قرآن کریم نے سورۃ الکہف میں یہ تعلیم دی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۭ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ڨ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاۗءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾﴾

”(اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں بعض اہلِ کتاب) کہیں گے کہ وہ تین ہیں اور چوتھا ان کا کُتّا ہے‘ اور بعض کہیں گے کہ وہ پانچ ہیں اور چھٹا ان کا کُتّا ہے‘ یہ لوگ اٹکل پچو ہانک رہے ہیں‘ اور بعض کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کُتّا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ میرا رب ان کی تعداد خوب جانتا ہے‘ انہیں بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں‘ سو آپ ان کے بارے میں صرف سرسری گفتگو ہی کریں اور آپ ان کے بارے میں ان لوگوں (اہلِ کتاب) میں سے کسی سے بھی نہ پوچھیں۔“

اس آیت قرآنی میں اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں اہلِ کتاب کی

مختلف اسرائیلی روایات بیان فرمائی ہیں‘ نیز ساتھ ہی درج ذیل باتوں کی طرف اشارہ فرمادیا ہے:

(۱) اسرائیلی روایات اوران کا اختلاف بیان کرنا جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا۔

(۲) ان میں جو روایتیں غلط ثابت ہو چکی ہوں ان کے غلط ہونے پر تنبیہہ بھی کر دینی چاہیے‘ جیسا کہ پہلے دو اقوال کو اللہ تعالیٰ نے ’’رَجْمًا بِالْغَيْبِ‘‘ کہہ کر ردّ فرمایا ہے۔

(۳) جس روایت کی غلطی پر کوئی دلیل نہ ہو‘ اس کے بارے میں سکوت اختیار کرنا چاہیے‘ جیسا کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے تیسری روایت پر سکوت اختیار فرمایا۔

(۴) ان روایات کے صدق وکذب کے بارے میں یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

(۵) ان روایات کے بارے میں زیادہ بحث ومباحثہ سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

(۶) ایسی روایات (یا سوالات) کی زیادہ تحقیق وتفتیش میں پڑنا بھی درست نہیں‘ کیونکہ ان سے دنیا وآخرت کا کوئی قابلِ ذکر فائدہ وابستہ نہیں۔

اسرائیلیات کے بارے میں فتح الباری میں حضور اکرم ﷺ کے دو ارشادات نقل ہوئے ہیں:

(ا) ’’ایک آیت بھی ہو تو مجھ سے سن کر آگے پہنچا دو‘ بنی اسرائیل کی روایات بیان کرو‘ اس میں کچھ مضائقہ نہیں‘ اور جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا اس نے اپنا گھر دوزخ میں بنایا۔‘‘

(ب) ’’اہلِ کتاب کی نہ ہی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب‘ یوں کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس کے نازل کردہ کلام پر ایمان لائے۔‘‘

مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں۔ پہلی حدیث میں بنی اسرائیل کے عجیب وغریب واقعات بیان کرنے کی اجازت دی گئی ہے‘ جن سے وہ دوچار ہوئے۔ ایسے واقعات اور قصص میں عبرت پذیری اور نصیحت آموزی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نقل وروایت کی یہ اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان واقعات کا جھوٹا ہونا معلوم نہ ہو‘ اس لیے کہ آنحضور ﷺ ایک جھوٹی بات روایت کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دے سکتے۔ اس کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ تحریر کرتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ

نبی کریم ﷺ جھوٹی روایت بیان کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس لیے پہلی حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جس بات کے جھوٹے ہونے کا تمہیں علم نہ ہو‘ بنی اسرائیل کے بارے میں وہ بیان کرو‘ کیونکہ سچی بات کی نقل وروایت میں کچھ مضائقہ نہیں۔ بعد والی حدیث بھی اسی کی مانند ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب‘ جو بات سچی اور قطعی ہو اس کو روایت کرنے سے آنحضرت ﷺ نے منع نہیں فرمایا۔ چنانچہ دوسری حدیث کا مفہوم یہ ہوا کہ اہلِ کتاب کی بیان کردہ بات میں جب صدق وکذب دونوں کا احتمال ہو تو اس میں توقف سے کام لیا جائے۔ اس لیے کہ بعض اوقات سچی بات کو جھٹلا دیا جاتا ہے اور جھوٹی بات کی تصدیق کی جاتی ہے‘ جس سے نقصان ہوتا ہے۔ البتہ اہلِ کتاب کی جو بات ہماری شریعت کے خلاف ہو‘ ہم اس کی تکذیب کر سکتے ہیں‘ اور جو بات ہمارے دین کے خلاف نہ ہو‘ اس کی تصدیق کی ہمیں پوری اجازت ہے۔

ابن حجرؒ نے اس حدیث کی تشریح میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس ضمن میں وارد شدہ اسلاف کے اقوال کو ہم اسی بات پر محمول کرتے ہیں۔ محدّث ابن بطّالؒ نے مہلب سے نقل کیا ہے کہ اہل کتاب سے سوال کی ممانعت ایسے امور سے متعلق ہے جس میں کوئی نص وارد نہ ہوئی ہو۔ ایسے امور میں نص کے نہ ہوتے ہوئے صرف فکر واستدلال سے کام لینا چاہیے‘ ان (اہلِ کتاب) سے سوال کی ضرورت نہیں۔ حدیث میں ان باتوں میں سوال کی ممانعت شامل نہیں جن سے ہماری شریعت کی تصدیق ہوتی ہو یا جن کا تعلق گزشتہ اقوام واُمم کے ساتھ ہو۔

اسرائیلیات کی قدر وقیمت

ابن تیمیہؒ کے ’’مقدّمہ اصولِ تفسیر‘‘ میں بیان ہے کہ اسرائیلی روایات درج ذیل تین اقسام پر مشتمل ہیں:

(ا) وہ روایات جو بسند صحیح نبی کریم ﷺ سے منقول ہیں‘ جیسے یہ روایت کہ قرآن مجید کی سورۃ الکہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جس رفیق کا ذکر کیا گیا ہے‘ وہ حضرت خضر تھے۔ یہ قسم صحیح اور مقبول ہے۔

(ب) اس میں وہ مرویات شامل ہیں جن کی تکذیب اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ شریعت کے معروف مسائل اور عقل سلیم سے ٹکراتی ہیں۔ ایسی روایات کو نہ تو قبول کرنا درست ہے اور

نہ ہی ان کی آگے نقل وروایت جائز ہے۔

(ج) تیسری قسم میں اہلِ کتاب کی وہ روایات ہیں جو پہلی اور دوسری قسم میں داخل نہیں اور جن کے بارے میں محدّثین نے سکوت اختیار کیا ہے۔ ایسی روایت کی نہ تو تصدیق کی جائے گی اور نہ ہی تکذیب' بلکہ اس کے بارے میں توقف سے کام لیا جائے گا' البتہ ان کی نقل و روایت درست ہے۔ اس ضمن میں نبی مکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کریں نہ تکذیب اور یوں کہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا۔

اس تیسری قسم کا تعلق زیادہ تر ان روایات سے ہے جن سے کوئی دینی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر اہلِ کتاب کے علماء کے ہاں بھی ایسے امور کے بارے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مفسّرین بھی اس حوالے سے مختلف الخیال ہیں جیسے کہ اصحابِ کہف کے نام کیا تھے؟ ان کا کُتّا کس رنگ کا تھا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کس درخت سے بنایا گیا تھا؟ ان پرندوں کے نام کیا تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے زندہ کیا تھا؟ گائے کے گوشت کا وہ کون سا ٹکڑا تھا جس کو اسرائیلی مقتول کے جسم سے لگایا گیا تھا؟ اور اس قسم کے دیگر امور جن کو قرآن شریف میں مبہم رکھا گیا ہے اور جن کے تعیّن اور واضح کرنے سے لوگوں کو کسی قسم کا کوئی دینی یا دُنیوی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

جب کسی صحابیؓ سے صحیح سند کے ساتھ کوئی ایسی بات نقل ہو کر ہم تک پہنچے جس کے بارے میں شریعت خاموش ہو اور اس میں تصدیق وتکذیب کا کوئی پہلو بھی موجود نہ ہو تو اس کے بارے میں ہم غور وفکر سے کام لیں گے۔ اگر صحابی پورے وثوق کے ساتھ وہ بات کہہ رہا ہو تو وہ قسم اوّل کی طرح مقبول ہو گی' اس لیے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ممانعت کے باوجود صحابیؓ نے اسے اہلِ کتاب سے اخذ کیا ہو۔ اور اگر صحابی وہ بات پورے جزم ووثوق سے نہیں بھی کہتا' تو بھی اس روایت کو قبول کر لینا اقرب الی الصواب ہے' اس لیے کہ اس روایت کو حضورِ اَقدس ﷺ یا کسی اور صحابی سے سننے کا احتمال اہلِ کتاب سے سننے کے احتمال سے قوی تر ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ تابعین و تبع تابعین کی نسبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہلِ کتاب سے بہت کم استفادہ کیا کرتے تھے' جبکہ تابعین اہل کتاب سے اخذ و استفادہ میں

معروف ہیں۔ اگر کوئی بات تابعین سے منقول ہو کر ہم تک پہنچے تو اس میں ہم توقف سے کام لیں گے اور اس کے صدق وکذب کے متعلق فوری کوئی فیصلہ صادر نہیں کریں گے' مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ مفسّرین اس سماع پر متفق نہ ہوں۔ دوسری صورت میں اگر مفسّرین اس حوالے سے اتفاق رکھتے ہوں کہ تابعین نے یہ روایت اہلِ کتاب سے نہیں لی' تو پھر اس کو اہلِ کتاب کی روایت قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ شرحِ صدر کے ساتھ اس روایت کو مقبول تسلیم کر لیا جائے گا۔

اسرائیلیات کے رواۃ

تفسیر بالماثور پر مشتمل کتب تفسیر کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ اسرائیلیات (اسرائیلی روایات) کا مدار وانحصار زیادہ تر درج ذیل راویوں پر ہے:

(ا) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

آپ عبداللہ بن سلام بن حارث اسرائیلی ہیں' کنیت ابو یوسف ہے۔ آپ حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام کی نسل سے تھے۔ جب حضور اقدس ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ مشرف باسلام ہوئے۔ صحیح بخاری' باب الہجرۃ میں ان کے اسلام لانے کا ذکر یوں ہے: عبداللہ بن سلام نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: ''مَیں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ یہود اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ مَیں ان کا سردار اور سردار کا بیٹا ہوں۔ مَیں ان میں سب سے بڑا عالم اور بہت بڑے عالم کا بیٹا ہوں۔ آپؐ یہود کو بلا کر میرے متعلق پوچھئے' قبل اس سے کہ انہیں میرے اسلام لانے کا پتہ چلے۔ اگر انہیں میرے اسلام لانے کا علم ہو گیا تو میرے بارے میں وہ باتیں کہیں گے جو مجھ میں نہیں پائی جاتیں''۔ اس پر حضور اقدس ﷺ نے یہود کو بلایا' جب وہ آ گئے تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اے گروہ یہود! تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ میں خدا کا سچا رسول ہوں' لہٰذا اسلام لے آؤ۔ یہود نے کہا ہمیں نہیں معلوم! آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں عبداللہ بن سلام کیسا آدمی ہے؟ یہود کہنے لگے کہ وہ ہمارا سردار اور سردار کا بیٹا ہے' وہ بہت بڑا عالم اور عالم کا بیٹا ہے۔ ارشادِ نبوت ہوا کہ اگر وہ مسلمان ہو چکا ہو تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ کہنے لگے کہ بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عبداللہ بن سلام باہر آ جائیں۔ وہ نکل آئے اور

یہود کو مخاطب کر کے کہا کہ اے گروہِ یہود! خدا سے ڈرو‘ بخدا تم جانتے ہو کہ یہ سچے رسول ہیں۔ یہود کہنے لگے کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے یہود کو نکال دیا۔

بعض علماء کے نزدیک ان کا نام الحصین تھا‘ حضورِ اَقدس ﷺ نے عبداللہ رکھا اور ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی۔ امام بخاریؒ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ مَیں نے کسی زمین پر چلنے والے انسان کے بارے میں حضورِ اَقدس ﷺ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ وہ جنتی ہے‘ مگر عبداللہ بن سلام کے بارے میں آپؐ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ ساتھ ہی (حضرت سعدؓ نے) یہ بھی فرمایا کہ ان کے بارے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی: ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ (الاحقاف:۱۰) ’’بنی اسرائیل کا ایک گواہ اس پر گواہی دے چکا۔‘‘

عبدالملک بن عمیر نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے بھتیجے سے نقل کیا ہے کہ جب باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے جمع ہوئے تو عبداللہ بن سلامؓ آپؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آنے کی وجہ پوچھی تو کہا کہ آپ کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ جا کر لوگوں کو ہٹائیے‘ آپ کا باہر جانا یہاں رہنے سے بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے باہر جا کر باغیوں کو مخاطب کر کے کہا: ’’لوگو! میرا نام دورِ جاہلیت میں کچھ اور تھا‘ نبی کریم ﷺ نے میرا نام عبداللہ رکھا۔ میرے بارے میں قرآن کی آیت ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ (الاحقاف:۱۰) اور ﴿قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَكُمۡ﴾ (الرعد:۴۳) نازل ہوئی۔ اللہ کی تلوار ابھی نیام میں ہے‘ اس شہر میں حضور ﷺ نے نزولِ اجلال فرمایا تھا‘ یہاں فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ عثمانؓ کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور انہیں قتل نہ کرنا۔ اگر تم نے عثمان کو قتل کر دیا تو تمہارے پڑوسی فرشتے یہاں سے چل دیں گے اور اللہ کی تلوار جو نیام میں ہے‘ باہر نکل آئے گی اور پھر کبھی واپس نیام میں نہیں جائے گی‘‘۔ لیکن باغیوں پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا‘ بالآخر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے چھوڑا۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں۔ پھر

ان سے ان کے دونوں بیٹوں یوسفؒ و محمدؒ اور بعض صحابہ مثلاً حضرت ابوہریرہ‘ ابوبردہ رضی اللہ عنہما اور بعض تابعین مثلاً عطاء بن یسارؒ وغیرہ نے استفادہ کیا۔ بیت المقدس اور جابیہ کی فتح کے وقت حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رفاقت حاصل رہی۔ ۴۳ھ میں آپؓ نے مدینہ میں ہی وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا علمی مقام

جہاں تک آپؓ کے علمی پائے کا تعلق ہے‘ اس کے اثبات کے لیے صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت ہی کافی ہے‘ جس میں انہوں نے اپنے بارے میں کہا کہ مَیں یہود کا عظیم عالم اور ایک فاضل باپ کا بیٹا ہوں۔ آنحضرت ﷺ کی موجودگی میں خود یہود نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی ایک عالم فاضل کی حیثیت سے معروف تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا آخری وقت آ پہنچا تو ان سے عرض کی گئی کہ ہمیں وصیت فرمائیں۔ کہنے لگے کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ پھر حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ علم و ایمان کا مرکز و محور چار اشخاص ہیں: ابودرداء‘ سلمان فارسی‘ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہم)‘ مَیں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عبداللہ بن سلام دس جنتی صحابہ میں سے ایک ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا علم و فضل کے اس اعلیٰ درجے پر فائز ہونا چنداں حیرت کا سبب نہیں‘ اس لیے کہ آپؓ کی ذات میں قرآن اور تورات دونوں کا علم جمع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپؓ اسلامی اور یہودی تہذیب و ثقافت کا سنگم تھے۔ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں عبداللہ بن سلامؓ سے بکثرت تاریخی اقوال نقل کیے ہیں‘ دیگر مؤرخین نے بھی آپ سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح مفسّرین نے بھی ان سے بے شمار اسرائیلی روایات نقل کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی (اسرائیلی) مرویات کے بارے میں اصولی موقف یہ ہے کہ نہ ہی ان سب کا ابطال کیا جائے اور نہ ہی ان سب کو مکمل طور پر قبول کر لیا جائے۔ ان تمام روایات کو جانچ پڑتال کے لیے مقرر کردہ کسوٹی پر پرکھا جائے گا‘ صحیح کو قبول کیا جائے گا اور غیر صحیح کو ترک کر دیا جائے گا۔

خلاصۂ کلام کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے علم و فضل میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور نہ ہی ان کی ثقاہت و عدالت پر کوئی حرف ہے۔ آپ منتخب اور اہلِ علم صحابہ میں شمار ہوتے

ہیں۔آپ کے بارے میں آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں اور امام بخاری اور دیگر محدثین نے ان پر اعتماد کیا ہے۔اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد بھی کسی نے ان کے علم وفضل کو شک وشبہ کی نگاہ سے قطعاً نہیں دیکھا۔

(ب) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما

آپ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص ہیں' کنیت ابومحمد اور ابوعبدالرحمٰن ہے۔آپ کا تعلق قریش کے خاندان بنوسہم سے ہے۔آپ اپنے والد ماجد سے پہلے ہی مشرف باسلام ہوکر مدینہ ہجرت کر چکے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت وعقیدت تھی۔اکثر بارگاہِ رسالت میں حاضر رہتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ذوق وشوق سے سنا کرتے تھے' ان کو یاد بھی رکھتے اور لکھ بھی لیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی کثرتِ عبادت کا یہ حال تھا کہ صحیح معنوں میں دائم الصوم اور قائم اللیل ہو گئے تھے۔اہل وعیال اور دوسرے دنیاوی معاملات سے بے نیازی اختیار کر لی تھی۔جب پدرِ بزرگوار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آئے اور بیٹے کا یہ حال دیکھا تو سمجھایا کہ عبادات میں اتنی شدّت مناسب نہیں' اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے' لیکن حضرت عبداللہ اپنی روش پر قائم رہے۔اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اپنے فرزند کی راہبانہ زندگی کا ماجرا عرض کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو بلا کر تلقین فرمائی کہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا ادا کرنا بھی ضروری ہے' اس لیے عبادت اسی قدر کرنی چاہیے کہ نہ اہل وعیال اور دوسروں کی حق تلفی ہو اور نہ ہی جسم پر حد سے زیادہ بوجھ پڑے۔نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اپنے والد کی اطاعت کا بھی حکم دیا۔مسند احمد میں ہے کہ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ''یہی میرا طریقہ ہے' اور جو میرے طریقے سے ہٹ کر چلے گا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

صحیحین کی ایک روایت کے مطابق ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا' جب حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور رات بھر (نوافل پڑھتے ہوئے) قیام کرتے ہو (کیا واقعتاً ایسا ہی ہے؟) انہوں نے عرض کیا: 'ہاں! یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!' اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد

فرمایا کہ یہ طریقہ چھوڑ دو' روزے بھی رکھا کرو اور ناغہ بھی کیا کرو' اسی طرح رات کو نمازیں بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو' کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے (یعنی جسم پر حد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو)' اسی طرح تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے (یعنی اس کو سونے اور آرام کرنے کا موقع دو)' اسی طرح تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمانوں' ملاقاتیوں کا بھی تم پر حق ہے (یعنی ان سب کو نظر انداز کر کے عبادت میں مشغول نہ رہو)۔جو ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھے اُس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں' ہر مہینے میں تین دن کے نفلی روزے رکھ لینا (یعنی رمضان المبارک کے فرض روزوں کے علاوہ) ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے (کیونکہ ایک نیکی کا دس گنا معاوضہ ہوتا ہے) اس لیے تم ہر مہینے بس تین روزے رکھ لیا کرو اور پورے مہینے میں ایک قرآن پاک (تہجد میں) ختم کر لیا کرو۔حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔اس پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم پھر داؤد علیہ السلام کی طرح روزے رکھا کرو' وہ یوں کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار (یعنی روزے کا ناغہ) اور تہجد میں سات دنوں میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو' اس سے زیادہ نہ کرو۔اب حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور آئندہ اسی کے مطابق عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

آپؓ کو جہاد فی سبیل اللہ کا بھی بے انتہا شوق تھا' اکثر غزوات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا کرتے تھے۔۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے سفر میں بھی آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفقاء میں شامل تھے۔صحیحین کی روایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ناواقفیت کی بنا پر میں نے ذبح کرنے سے پہلے سر منڈوا لیا۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ذبح کرو اور پھر سر منڈوالو' کوئی حرج نہیں۔دوسرے شخص نے آ کر عرض کیا کہ ناواقفیت کی بنا پر میں نے کنکریاں مارنے سے پہلے قربانی کر لی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اب کنکریاں مار لو' اس میں کوئی حرج نہیں۔مختصر یہ کہ تقدیم و تاخیر کے جو مسائل بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیے گئے' آپؐ نے ان سب کے جواب میں یہی فرمایا کہ اب کر لو' کوئی حرج نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے جہادِ شام میں بھرپور

حصّہ لیا۔ جنگ یرموک میں آپؓ نہایت پامردی سے لڑے اور کسی بھی نازک موقع پر اپنے پائے استقلال میں جنبش نہ آنے دی۔ خلافت عثمانی میں والیٔ مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے جب جہادِ افریقہ کا آغاز کیا تو دیگر صحابہ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بھی اپنی شجاعت کی دھاک بٹھا دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی نے سر اٹھایا تو آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے اپنے والد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں رہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے خلاف عملاً کوئی کارروائی نہیں کی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ مدینہ منورہ، طائف اور مصر میں گزارا۔ خلافتِ فاروقی میں آپؓ کے والد ماجد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر فتح کیا۔ مؤرخین نے اگرچہ تصریح نہیں کی لیکن گمان غالب یہی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بھی والد ماجد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہادِ مصر میں حصّہ لیا۔ تسخیر مصر کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کئی سال وہاں مقیم رہے۔ جب خلافت عثمانی میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ امارتِ مصر سے سبکدوش کر دیے گئے تو ان کے ہمراہ حضرت عبداللہؓ بھی مدینہ واپس آ گئے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمروؓ بن العاص کو دوبارہ مصر کا والی مقرر کر دیا تو آپؓ بھی ان کے پاس مصر لوٹ گئے۔ جب حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مصر کے شہر فسطاط میں مقیم تھے کہ ۶۵ھ میں آپ کا وقتِ آخر آ پہنچا۔ نماز جنازہ کے بعد تذکرۃ الحفاظ کے مطابق آپ کو اپنے گھر میں ہی دفن کر دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا علمی رتبہ

آپؓ ان عظیم المرتبت صحابہ میں شامل ہیں جن کو بارگاہِ رسالت میں خاص تقرب حاصل تھا۔ عہد رسالت میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا سب سے نمایاں کام جس کا اربابِ سیر نے خصوصیت سے ذکر کیا ہے، وہ احادیثِ نبویؐ کی کتابت ہے۔ آپؓ کو اکثر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، آپ لسانِ رسالتؐ سے سنی ہر بات کو یاد کرنے کے ساتھ لکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بعض اصحاب نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی رضا کی حالت میں بولتے اور کبھی غضب کی حالت میں،

تم سب کچھ لکھ ڈالتے ہو! اس پر حضرت عبداللہؓ نے فیصلہ کیا کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ نہ لیں، آپؐ کی کوئی بات نہیں لکھیں گے۔ پھر جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا تو آپؐ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ((اُكْتُبْ، فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا یَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّا حَقٌّ)) ''لکھو! اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس منہ سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔'' (ابوداؤد، مسند احمد) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت ملنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے دوبارہ احادیث لکھنا شروع کر دیں اور ان کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس کا نام ''الصَّادقة'' رکھا۔ اس مجموعے کو وہ نہایت عزیز رکھتے اور کبھی بھی اس کی مفارقت گوارا نہیں کرتے۔ آپؓ خود فرماتے تھے: ما یرغبنی فی الحیاۃ الا الصَّادقة یعنی مجھ کو زندگی کا خواہش مند یہی کتاب ''الصادقة'' بنا رہی ہے، یہ نہ ہو تو پھر مجھے جینے کی خواہش ہی نہیں۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما خود ہی ''الصادقة'' کی تعریف اس طرح کرتے: فاما الصادقة فصحیفة کتبتُها من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی الصادقہ وہ صحیفہ ہے جس کو مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سن سن کر لکھا ہے (سنن الدارمی)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے وصال کے بعد ''الصادقة'' ان کے بیٹے شعیب کے پاس آیا اور بعد میں ان کے بیٹے عمرو کو ملا۔ انہوں نے اپنے والد (شعیب) کے واسطے سے اسی صحیفے (مجموعے) کی احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بڑی خوش دلی کے ساتھ حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ لوگ دور دور سے سماعِ حدیث کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ خندہ پیشانی سے ان کی پذیرائی کرتے۔ ایک دفعہ لوگوں کے ایک بہت بڑے مجمع نے ان کو گھیر رکھا تھا کہ ایک شخص نے بھیڑ کو چیر کر ان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کی۔ لوگوں نے اسے روکا تو حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اسے آنے دو۔ لوگوں نے اس کو راستہ دے دیا اور وہ آ کر آپ کے پاس بیٹھ گیا اور بولا کہ اے صاحبِ رسولؐ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی ارشاد مجھے سنائیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے متبسّم ہو کر فرمایا کہ مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَیَدِهٖ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَی اللّٰهُ عَنْهُ)) ''مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے کہ جس نے اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دیا۔'' (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ جہاں بھی تشریف لے جاتے‘ شائقینِ علم ان کی والہانہ پذیرائی کرتے اور ہر وقت سینکڑوں کی تعداد میں ان کے گرد جمع رہتے۔ امام ذہبی کے مطابق اہلِ بصرہ کو ان سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کے ساتھ حلقہ درس میں غالب تعداد ان ہی کی ہوتی تھی۔ فیضانِ نبویؐ سے بہرہ یاب ہونے کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے عبرانی زبان بھی بڑی محنت سے سیکھی تھی اور تورات وانجیل کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ چنانچہ وہ ایک ایسے عالم بن گئے جن کو قرآن وحدیث کے ساتھ تورات وانجیل کے مضامین پر بھی عبور حاصل تھا۔

گمان ہے کہ صحابہ کرامؓ میں سب سے زیادہ اسرائیلی روایات حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سریانی زبان باقاعدہ سیکھی تھی (طبقات ابن سعد)۔ اس زمانے میں یہود ونصاریٰ کی بہت سی کتابیں اسی زبان میں تھیں۔ جنگ یرموک کے موقع پر حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو اس قسم کی کتابیں اتنی بھاری تعداد میں ہاتھ آ گئی تھیں کہ وہ دو اونٹوں پر لادی جاتی تھیں۔ حضرت عبداللہؓ نے کافی احادیث آنحضرت ﷺ سے بھی روایت کی ہیں‘ ان کا اسرائیلیات سے کوئی تعلق نہیں۔ صحیح سند سے ثابت ہونے پر ان کی روایات بھی دوسرے صحابہ کرامؓ کی روایات کی طرح قابلِ تسلیم ہیں۔ جو روایات انہوں نے صراحتاً اہل کتاب سے نقل کی ہیں وہ ’’اسرائیلیات‘‘ کے ذیل میں ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح جو روایات حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے اپنے مقولے کے طور پر منقول ہیں‘ ان کے بارے میں بھی اکثر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اسرائیلیات ہیں اور ان کو اسلامی عقائد کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو آنحضرت ﷺ سے اس قدر عقیدت تھی کہ آپؐ سے کوئی خاص دعا سنتے تو اسے اپنی اولاد کو بھی تلقین فرماتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضورِ اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی سوتے میں ڈر جائے تو یوں دعا کرے:

((اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ))

’’میں اللہ کے بے عیب کلمات کے ذریعے اُس کی پناہ میں آتا ہوں‘ خود اُس کے غضب سے اور اُس کی سزا سے اور اُس کے بندوں کے شر سے اور شیطانی وساوس و اثرات سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں (اور مجھے ستائیں)۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پھر شیاطین اس بندے کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پوتے حضرت شعیبؒ کا بیان ہے کہ ہمارے دادا کا یہ معمول تھا کہ ان کی اولاد میں جو بڑے اور بالغ ہو جاتے‘ وہ یہ دعا ان کو تلقین فرماتے تاکہ وہ بھی اس دعا کو اپنا معمول بنا لیں‘ اور جو چھوٹے نابالغ بچے ہوتے تو یہی دعا ایک کاغذ پر لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیتے۔ (ترمذی‘ ابوداؤد)

(ج) حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ

آپ کعب بن ماتع حمیری‘ کنیت ابواسحاق اور کعب الاحبار یا کعب الحبر کے لقب سے مشہور ہیں۔ یہ یمن کے رہنے والے تھے اور علمائے یہود میں انہیں ممتاز مقام حاصل تھا۔ انہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں کا زمانہ پایا لیکن حضور ﷺ کی حیات میں مشرف باسلام نہ ہو سکے۔ ۱۲ھ میں حضرت عمرؓ کی خلافت کے دوران آپ مدینہ منورہ آ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ طبقات ابن سعدؒ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں کیوں اسلام نہیں لائے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے باپ نے مجھے تورات کا ایک نسخہ لکھ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ اس پر عمل کرتے رہو‘ اور اس کے علاوہ جتنی کتابیں تھیں انہیں بند کر کے ان پر مہریں لگا دی تھیں تاکہ میں ان کا مطالعہ نہ کروں‘ اور ساتھ ہی مجھ سے اپنے رشتۂ ابوّت کا واسطہ دے کر یہ عہد لیا تھا کہ میں یہ مہریں نہ توڑوں۔ لیکن جب دین اسلام دنیا میں غالب ہونے لگا تو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے باپ نے مجھ سے کوئی علم چھپانے کی کوشش نہ کی ہو‘ چنانچہ میں نے ان کتابوں کی مہر توڑ دی اور ان کا مطالعہ کیا‘ تو اس میں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی اُمّت کا تذکرہ مجھے ملا‘ اس لیے میں اب مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ (مقالات الکوثری)

خلافتِ فاروقی میں حضرت کعب نے رومیوں کے خلاف جہاد میں حصّہ لیا۔ خلافتِ عثمانی میں شام میں رہائش رکھ لی۔ ابن سعید نے آپ کو تابعین شام کے طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا ہے۔ صحیح قول کے مطابق ۳۲ھ میں آپ نے حمص کے مقام پر وفات پائی‘ اس وقت عمر ایک سو چالیس برس تھی۔ کعب الاحبار نے آنحضرت ﷺ سے مرسلاً احادیث روایت کی ہیں۔ نیز انہوں نے حضرت عمرؓ‘ حضرت صہیب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کی ہے۔ حضرت کعب سے

روایت کرنے والوں میں حضرات ابوہریرہ‘ ابن عباس‘ معاویہ رضی اللہ عنہم‘ عطاء بن ابی رباحؒ اور دیگر اکابر کے نام شامل ہیں۔

حضرت کعب الاحبارؒ کا علمی مقام

آپ اسلام کے ساتھ تورات اور انجیل کے بھی عظیم عالم تھے‘ اسی بنا پر آپ کو کعب الاحبار اور کعب الحبر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کتبِ تفسیر میں آپ کے جو اقوال منقول ہیں‘ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کعب حد درجہ وسیع العلم نیز اسلام اور یہودیت کے بہت بڑے فاضل تھے۔ آپ نے کوئی کتاب تالیف نہیں کی بلکہ سینہ بہ سینہ آپ کا علم آگے منتقل ہوتا رہا۔ بقول ابن سعد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کعب الاحبار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بہت بڑے صاحبِ علم ہیں۔ محمد بن عثمان بن ابی شیبہ نے بطریق ابن ابی ذئب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میرے عہدِ حکومت میں جو کچھ ہوا‘ کعب الاحبار نے قبل از وقوع اس کی اطلاع دے دی تھی۔ (تہذیب التہذیب)

اسی طرح ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ کعب الاحبار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تین دن قبل انہیں طبعی عمر ختم ہو جانے سے آگاہ کر دیا تھا‘ اور بتایا تھا کہ تورات میں نام تو مذکور نہیں‘ البتہ آپ کی صفات وحلیہ اور عمر طبعی کے ختم ہو جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی علمی عظمت کے باوصف حضرت کعب الاحبار سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ امام مسلم نے صحیح مسلم‘ کتاب الایمان کے آخر میں کعب الاحبار سے متعدد روایات نقل کی ہیں۔ اسی طرح امام ابوداؤد‘ ترمذی اور نسائی نے بھی آپ سے روایت کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کعب الاحبار اصحابِ صحاح کے نزدیک ثقہ راوی ہیں اور کسی طرح بھی مطعون نہ تھے۔ علامہ محمد زاہد کوثری نے کعب الاحبار کے حوالے سے کچھ شکوک وشبہات ظاہر کیے ہیں لیکن ان کا مدلّل جواب دیا جا چکا ہے۔ اسلام لانے کے بعد بھی ان کا سابقہ کتب سماوی اور صحف سے تعلق ختم نہیں ہوا تھا۔ بنا بریں کعب الاحبار کی بیشتر روایات اسرائیلی ہیں۔ جب تک ان کی تصدیق خارجی دلائل سے نہ ہو جائے اس وقت تک ان پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

❁❁❁

Dec 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.12

Monthly **Meesaq** Lahore

بانی محترمؒ کے مختصر مگر جامع خطاباتِ جمعہ
حکمت و فلسفہ دین اور اہم دینی مسائل پر مشتمل کتاب

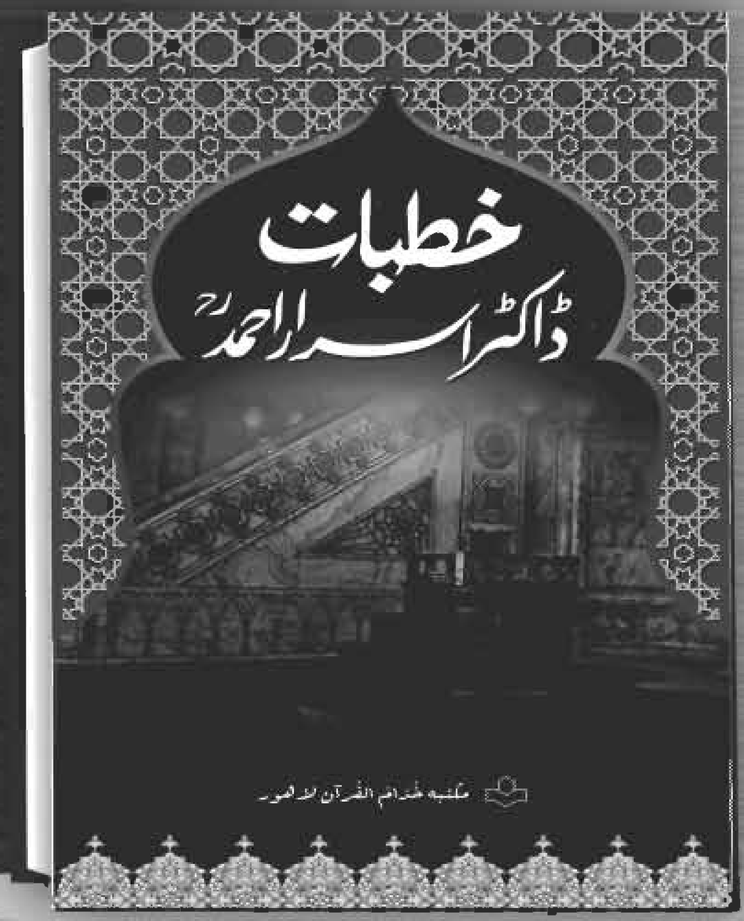

قیمت: -/400
22 خطبات کا مجموعہ
384 صفحات

امپورٹڈ بک پیپر
معیاری طباعت
دیدہ زیب ٹائٹل
مضبوط جلد

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)